ساہتیہ اکادمی کی طرف سے انعام یافتہ پنجابی کہانیاں
کچھ اَن کہا بھی
پریم پرکاش

کچھ ان کہا بھی

سرورق کے آخری صفحہ پر سنگ تراشی کے جس نمونے کی تصویر دی گئی ہے، اس میں تین جیوتشی بھگوان بدھ کی ماتا مہارانی مایا کے خواب کی تعبیر بیان کر رہے ہیں۔ اور ان کے نیچے ایک کاتب بیٹھا ان کی تعبیر قلمبند کر رہا ہے۔
یہ شاید ہندستان میں لکھنے کے فن کی قدیم ترین تصویری مثال ہے۔

(ناگ ارجن کونڈ دوسری صدی عیسوی)
(بشکریہ نیشنل میوزیم۔ نئی دلی)

ساہتیہ اکادمی کی طرف سے انعام یافتہ پنجابی کہانیاں

(کہانیوں کا مجموعہ)

مصنّف، مترجم

پریم پرکاش

ساہتیہ اکادمی

Kuchh Ankaha Bhi : Urdu translation by Prem Prakash of his Akademi's award-winning Punjabi short stories **Kujh Ankeha Vi** Sahitya Akademi, New Delhi (1998), Rs. 70.

پہلا ایڈیشن : ۱۹۹۸ء

ساہتیہ اکادمی

ہیڈ آفس

رویندر بھون۔ ۳۵ فیروز شاہ روڈ، نئی دہلی ۱

سیلز آفس

سواتی مندر مارگ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

علاقائی دفاتر

جیون تارا بلڈنگ۔ چوتھی منزل، ۲۳ اے/۴۴ ایکس۔ ڈائمنڈ ہاربر روڈ، کلکتہ ۷۰۰۰۵۳
۱۷۲ ممبئی مراٹھی گرنتھ سنگھرالیہ مارگ، دادر۔ بمبئی ۴۰۰۰۱۴
گنا بلڈنگ، دوسری منزل، ۳۰۴-۳۰۵، انا سلائی، تینام پیٹھ، مدراس ۶۰۰۰۱۸
اے۔ ڈی۔ اے رنگ مندر ۱۰۹ جے۔ سی۔ روڈ، بنگلور ۵۶۰۰۰۲

ISBN 81-260-0313-8

قیمت : ستر روپے (70)

طباعت : سریتا پرنٹرز، شاہدرہ، دہلی ۳۲

تعارف

پریم پرکاش اُس نفسیات کا افسانہ نگار ہے جو ہمارے معاشرہ کے تغیرات نے پیدا کی ہے۔ اس کی کہانیاں نفسیاتی محاورے میں جدید تاریخ ہیں۔ "ہمارے درمیان کوئی لکیر خود بخود کھنچی جارہی ہے، جو ہماری بدلتی ہوئی سوچ اور بدلتی ہوئی ذہنی کیفیت پر حاوی ہے..." گھر پریوار کی محبت وہ نہیں جس کو روایت کا سچ تسلیم کیا جاتا تھا... "ماں اور بھائی کیا ہوتے ہیں، مجھے نہیں معلوم ... تنہا رہ کر اپنے طور پر جینا... مجھے تو سب سے بڑا سکھ یہی لگتا ہے۔ کوئی اپنے طور پر آزاد ہو۔ وہ نہ کسی کے سہارے ہو اور نہ کوئی اس کے سہارے پر... بچے بھی نہیں۔"

ہماری تعلیم کی جڑ روایت میں ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے ہمیں ہر نئی بات غیر معمولی لگتی ہے۔ پریم پرکاش غیر معمولی نفسیات کا کہانی کار ہے۔ اس کی ایک طرف 'ناروا'، 'رکمنی' ہے اور دوسری طرف نفسیاتی طور پر اُلجھا ہوا 'گھوڑا' ہے۔ کہانی خود اذیت پسندی (میسوکزم) کی معنی خیز کردار نگاری ہے۔

غیر معمولی نفسیات ایسی ہے کہ 'آدمی'، اپنے ہی احساسات سے ڈر جاتا ہے۔ وہ خود سے پوچھتا ہے "میں کون ہوں؟..." وہ وراثت میں ملے مذہب سے نا مطمئن ہے اور کسی ذاتی مذہب کی تلاش کرتا ہے جو اُسے مطمئن کر سکے۔ اطمینان 'کون'، کو 'موت'، سے اوجھل رکھتا ہے۔ جس کا ذکر پریم پرکاش کی کہانیوں میں تقریباً ضروری ہوتا ہے۔ پریم کی کہانی کا موضوع بشر کی ذات کا دُنیاوی وجود ہے۔ جو ہمارے ملک میں اور ہمارے جیسے معاشروں میں دو سو برسوں سے پیدا ہو رہا ہے۔

"آدمی اس طرح کیوں ہو جاتا ہے؟ وہ اپنے گھر، کنبے، شہر کو چھوڑ کر بھاگ کیوں جاتا ہے؟ مجھے اپنے گھر، بچّوں اور بیوی کے ساتھ رہنے اور بچّے پیدا کرنے... شہر میں رہنے والے اپنے دوستوں اور سہیلیوں پر کھیج کیوں آگئی؟۔ مجھے ان سوالوں کے جواب چاہئیں... یہ سوال مجھے ٹِک کر بیٹھنے نہیں دیتے..." "عام بھارتی موت سے زیادہ ڈرتے ہیں۔ آتما کے امر ہونے اور گیتا گیان کا سہارا ڈھونڈ رہے ہیں"... "نشانی کا ہے کی... خاندان بنتے ہیں، لوٹ جاتے ہیں۔ کوئی کہیں چلا جاتا ہے اور کوئی کہیں..." "اس کی ارتھی (میّت) نیچے کیسے آتاریں گے؟ پتہ نہیں ہر ایک بوڑھے کو لیٹے ہوئے دیکھ کر مجھے یہ خیال کیوں آتا ہے؟ مجھے اپنی ارتھی جاتی ہوئی بھی دکھائی دیتی رہتی ہے...." "ہر شے اپنے خاتمے کی طرف بڑھ رہی ہے..." اس دنیاوی 'ناسمجھی' نے یہ حال کیا ہے کہ "یہ دکھ سا سکھ یا سکھ سا دکھ میرے پلّے کیوں پڑ گیا؟"

پریم پرکاش بیان کی کہانی نہیں لکھتا۔ بیان کے اپنے اسرار ہوتے ہیں، جس کے ٹھوس پن کا تعین کرنا مشکل ہوتا ہے۔ شعور کی گرفت میں آنے والی نفسیات کی کہانی واقعات کا سلسلہ نہیں بنتی، بلکہ واقعات پیٹرن (تصویری شکل) ہوتی ہے۔ واقعات کا پیٹرن نفسیات کے تحت الشعور کو ایسے دوہراتا ہے کہ ساری بات بالآخر قاری کے شعور میں داخل ہو جاتی ہے۔ پریم پرکاش کے 'بیان' کا وہی 'پیٹرن' ہے۔ یہاں تک کہ اُس کے فقروں کی بناوٹ اور الفاظ کی نشست بیانیہ وہ نہیں بلکہ نفسیاتی باریکیوں کے پیٹرن والی ہے۔ فقرے کی نغمگی یا روانی اُلجھی نفسیات کو شعور کی سطح پر کھینچتی سی محسوس ہوتی ہے۔ جب پریم پرکاش بیان کی طرف چلتا ہے تو قاری تذبذب میں پڑ جاتا ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ بات کہانی 'میڈم' میں بہت نمایاں ہے۔ کہانی 'گرِھستی' کے بیان سے لگتا ہے کہ اس نے دھوکہ دیا ہے۔ مگر تخلیق کا بنیادی تجربہ کہ 'آدمی کیا ہے؟' اس کو گرنے سے بچا لیتا ہے۔ میرا اب بھی یقین ہے کہ 'گرِھستی' پیٹرن کے اسلوب میں زیادہ نکھر آتی۔

کہانی "شولڈر بیگ" کے دو پیٹرن قابلِ غور ہیں۔ ۱۔ مجھے 'کچھ' ہو گیا ہے۔ میں درخت کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا ہوں۔ ۲۔ یہ 'کچھ' ہونا میری فطرت نہیں۔ ۳۔ اصل میں

مجھے مارا 'کچھ ہونے' نے اتنا نہیں جتنا 'کچھ ہونے' کے بارے میں سوچتے ہی رہنے کی عادت نے ہے۔ ۴۔ اب وہ میرے سامنے سے گزرے تو میں انھیں دکھائی ہی نہیں دیا۔ ۵۔ اس جذباتیت کو میں حماقت سمجھتا ہوں۔ وندنا جب مجھے ملی تھی، احمق ہی تھی۔ مگر اب میں خود اپنی نظروں میں احمق بنا کھڑا ہوں۔ ۶۔ وندنا میری کم آمیز فطرت کو چیرتی ہوئی میرے پاس آ بیٹھی تھی تو میں نے سوچا تھا کہ یہ جاتی کیوں نہیں؟ ۔ ۷۔ شولڈر بیگ چیزوں سے بھرا میرے کمرے میں آتا اور خالی ہو کر مڑ جاتا۔ ۸۔ اس کے منہ سے لفظ 'یار' سن کر مجھے محسوس ہوا تھا کہ اس عورت میں جرأت ہے۔ ۹۔ 'اور کیا اچھا لگتا ہے؟" ... "تو"... "اور کیا اچھا لگتا ہے؟" اس نے نظریں ہٹائے بغیر پوچھا... "تیرا سب کچھ"... "بس؟" اس نے میری نقل اتارتے ہوئے کہا تھا۔ "مجھے ایسی رومانٹک سی باتیں اچھی نہیں لگتیں"... ۔ ۱۰۔ میں اس کی محبت میں دبا سا محسوس کرتا... مگر اسے دیکھ کر اس کی ضد مان لیتا... ۔ ۱۱۔ مجھے اکثر محسوس ہوتا رہتا ہے کہ یہ جسم فروشی ہے۔ ذہن فروشی ہے اور ضمیر فروشی بھی۔ ایڈیٹری کرنا، شعر کہنا۔ محبت میں ڈوب جانا مشکلوں کو آسان کرنے کا چارہ بھر تو ہے۔ ۱۲۔ ایسا موسم دیکھ کر گھبراہٹ سی ہونے لگتی ہے۔ 'کچھ ہونے' کے بعد اور اُجالا کم ہونے سے میرا دل بھی کم ہونے لگتا ہے۔ ۱۳۔ میرا رومانٹک ہو کر بھی جینا مشکل ہے اور حقیقت کو سمجھتے ہوئے بھی۔ مجھے دونوں حالتوں میں مرنا ہے۔ ۱۴۔ میں جذبات سے عاری ساری راکھ اکھٹی کر کے کنستر میں ڈال کر رکھ دیتا ہوں۔ ۱۵۔ بس میں ہم دونوں چپ رہے۔ ۱۶۔ "تیری طرف میری ایک رات اُدھار ہے"... "تھی، مگر اب نہیں۔ ۱۷۔ اچھا مل جائے گی۔ مگر تم ہاتھ نہ باندھا کرو۔ مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ ۱۸۔ پتہ نہیں مجھے کیا ہوا۔ میں نے وہ تمام چیزیں میز پر سے گھسیٹ کر نیچے پھینک دیں۔ ۱۹۔ وہ سامنے جاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ لمبے بھورے بالوں والا... ساڑھی کا پلّو اُڑنے سے بچانے کے لیے آگے پھنسایا ہوا ہے۔ اُڑتے پرندے جیسا۔ ۲۰۔ یہ سب پراسٹی ٹیوشن ہے۔"

'وندنا' کے پیٹرن کی تخلیق بھی ایسے ہی ہوتی ہے۔ جس کے انجام تک کہانی کا رکردار پر حاوی ہو جاتا ہے۔ ۱۔ کیا پتہ تھا کہ اس کے شولڈر بیگ میں تحریروں کی بجائے

میک اپ کا سامان بھر جائے گا۔ ۲۔ یہ کچھ کر سکتی ہے۔ ۳۔ شوہر کو چھوڑنے کی ایڈونچر کرنے کو اُتاولی بھی... مجھے بزدل کہتی تھی، مگر ہمدردی کے ساتھ۔ ۴۔ بس میں ہم دونوں چُپ تھے۔ ۵۔ رات اُدھار تھی، مگر اب نہیں۔ اچھا دیا اُدھار۔ ۶۔ اُڑتے پرندے ایسے...

'وندنا' کے پیٹرن نمبر ۵ اور ۶ پہلے والے پیٹرن میں بھی آتے ہیں۔ کرداروں کا ٹکراؤ۔ نفسیات کے بدلتے ہوئے رُوپ۔ زمانۂ حال کی زندگی کی بے شکل سی صورت ان پیٹرنوں کے اختلاط میں ہے۔ کہانی کا خلاصہ اور اسلوب درمیان کے ایک پیرا میں ایسے ظاہر ہوتا ہے۔" میں گزری تھی۔ میں پھری دہیلیز پر تھی۔ میں نے تجھے چوک میں کھڑے کو دیکھا بھی تھا۔ میں نے رُکنا بھی چاہا تھا۔ لیکن مجھے دیر ہو گئی تھی... کافی ہاؤس میں بیٹھی رہی تھی۔ تیرے دوست کے انتظار میں۔ تو ہی آجاتا تو کتنا اچھا لگتا... اُس نے میرے چندائی نہ کہہ کر 'تیرا دوست' کہا تھا۔ شاید مجھے چڑانے کے لیے"۔

کیا 'دوست'... 'میں'، کردار کی ہی ایک شکل نہیں؟... کم عقل، سوسائٹی گرل، بے وفا، انٹلیکچول کہلانے والی کا انسانی، جذباتی اور شعوری عروج حصّہ نمبر ۲ میں آتا ہے۔ جس کا اپنے آپ اپنی شکل اختیار کرتا ہوا پیٹرن بیان کا محتاج نہیں...
"ایتوار کی صبح کو ہم تیری، برساتی (چھت والے کمرے) میں آئیں گے۔ پھر لڑ لینا مجھ سے۔ دیتے رہنا گالیاں"۔ جدید عورت ہونا کوئی آسان کام نہیں۔ اس کردار کا المیہ افسانہ نگار کے دل میں اتر کر کہیں بیٹھ سا گیا ہے۔

'یہ وہ جبیر نہیں'، ذہنی کیفیت کی کہانی ہے۔ فرقہ وارانہ سیاست نے ہندو 'دلو' اور سکھ 'جبیر' کی دوستی میں وہ دراڑ پیدا کر دی ہے کہ جذبات تو کجا الفاظ بھی مشترکہ نہیں رہے۔ وہ بھی جھاڑ پونچھ اور دیکھ بھال کر استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ خوف ہے کہ وہ قتل کرنے اور قتل کرنے کے خیالی اور جسمانی عمل کو نزدیک نہ کر دیں۔ انتہا پسند اپنی جان کی بازی لگا کر ہندو دوست کو بتانے جاتا ہے کہ وہ پانچ سات روز تک شام کے وقت اپنے گھر کو جلد لوٹ آیا کرے۔ نہ بس میں بات ہوتی ہے، نہ گھر آکر۔ نہ بچّوں کے ساتھ

رشتہ اُستوار ہوتا ہے۔ اور نہ ہی کُتے کو بلایا جاتا ہے۔ پہرہ دے رہے ہندو پر مخبر ہونے کا
شک ہوتا ہے۔ سکھ مہمان سے واردات کے ہو جانے کا ڈر ہے۔ حال ایسے پوچھا جاتا ہے
کہ "تم کتنے خوف زدہ ہو؟"... "موت سے خوف گھر میں آتا ہے، باہر نہیں"... "چلو چھوڑو۔
بہتر یہی ہے کہ اس وقت ہم ایسی باتیں نہ کریں"

یہ کہانیوں کے اس مجموعے کا تعارف ہے۔ پریم پرکاش کی تعریف نہیں۔ کسی کی بات کو
سمجھنا ہی اس کے لیے عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ زبانی تعریف کی نسبت اس کے فن
کے رموز کو سمجھنا زیادہ قابل تکریم ہے۔

سُرجیت ہانس
۷ر اپریل ۱۹۹۰ء

قاری بھی تخلیق کرتا ہے

یہ میری کہانیوں کا پانچواں مجموعہ ہے۔

اس میں شامل بارہ کہانیوں میں وہ تین کہانیاں 'مشن کمپاونڈ'، 'شولڈر بیگ' اور 'ٹیلی فون' میری خاص قسم کی کہانیوں (مکتی رنگ) کے انتخاب 'پریم کہانیاں' میں چھپ چکی ہیں۔ یہ تینوں کہانیاں اس مجموعہ میں اس لیے شامل کر رہا ہوں کہ وہ کسی ایک مجموعہ کا حصّہ بن جائیں۔

ان کہانیوں کی ترتیب ان کے چھپنے یا تخلیق ہونے کے وقت کے مطابق نہیں۔ 'گڑھی' سب سے نئی اور 'باپو' آخری کہانی ہے۔

میرا یقین ہے کہ ہر ایک قاری بذاتِ خود ایک کہانی کار ہوتا ہے۔ وہ کہانی پڑھتا ہوا الگ سے ایک کہانی کی تخلیق کرتا ہے۔ کرداروں کی شکل وصورت پیدا کرتا ہے۔ واقعات کی جگہوں کا تعین کرتا ہوا اپنے ذہن میں بٹھاتا ہے۔ پھر ہر جذبے کی تخلیق از سرِ نو کرتا ہوا حظ اُٹھاتا ہے... ایسا کرتے ہوئے اس کی کہانی میں بہت کچھ وہ بھی شامل ہو جاتا ہے جو کہانی کار نے لکھا نہیں ہوتا۔ اگر لکھا ہوتا ہے تو وہ الفاظ میں نہیں ہوتا، الفاظ کے نیچے کہیں چھپا ہوتا ہے۔ کہانی اس 'ان کہے' کی تخلیق ہونے سے ہی مکمل ہوتی ہے۔

یہ کہانیاں اکیلے میں نے نہیں لکھیں۔ ان کی تخلیق میں سرجیت ہانس، سرجیت کور، بھوشن۔ بھنڈاری اور جسونت دید کا بھی ہاتھ ہے۔

اس کتاب کی اشاعت میں سادھو سنگھ کی محبت شامل ہے۔

پریم پرکاش
۱۲ر فروری ۱۹۹۰ء

ترتیب

جنک دُلاری کے نام

جس نے مجھے کہانیاں لکھنے کی اجازت دی

گرِڈھی

یہ کہانی نہیں ۔ میرے گاؤں ماجرہ میں مشرق کی طرف کھنڈر ہوئی گرِڈھی اور اس سے پرے نئے تعمیر ہوئے اندر کور میموریل ہسپتال کی تاریخ ہے، جسے کوئی مورخ نہیں لکھ سکتا۔

تیز رفتار جا رہی ٹرین میں میں یہ باتیں لکھ رہا ہوں ۔ جو میرے ذہن میں قدرے دھندلی اور اُلجھی پڑی ہیں ۔ میں ٹھیک طور پر سمجھ بھی نہیں پا رہا ہوں ۔

وہ میری مجبوری تھی کہ میں نے بڑے شہر میں جا کر ایم اے تاریخ کی کلاس میں داخلہ لیا تھا۔ میں باپو کا حکم ٹال نہیں سکا تھا۔ ماں آخری سانس کے وقت کہہ گئی تھی ۔

میں اپنے گاؤں کے ایک لڑکے اوتار سنگھ تاری کے ساتھ نئی آبادی میں کمرہ کرائے پر لے کر رہ رہا تھا۔ اس کا باپ ہماری زمین کاشت کرتا تھا۔ دونوں گھروں میں سماجی رشتہ تھا۔ ہم سال بھر اکٹھے رہے تھے ۔ پھر میرے باپو کا انتقال ہو گیا۔ میں باپو کے پھول، ڈالنے گیا تھا تو گنگا نے مجھے پکڑ کر بٹھا لیا۔ جس گرِڈھی کو دیکھنے کی تمنا کرتے تھے لوگ، میرا دل اس میں پھر سے جانے سے کترا گیا ... یہ سوچ جیسے میرے ساتھ ہی پیدا ہوئی تھی ۔ مگر اُس وقت سے بہت طاقتور ہو گئی تھی جب آخری سانس لے رہی ماں نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ بھی جو باپو مجھ سے چھپاتا رہا تھا ۔ ویسے اس سچائی کا بیج میرے اندر لوگوں کی سرگوشیوں سے پیدا ہو گیا تھا۔ جن کے جھوٹ یا سچ ہونے کے بارے میں فیصلہ نہیں کر سکتا تھا۔ ویسے دل میں کوئی پھانس سی لگ گئی تھی ۔

جب پوری بات کا پتہ چلا تو میں شہر کے اس کمرے میں بیٹھا سوچتا ہوا ایسی حالت میں پہنچ جاتا تھا کہ ساتھ بیٹھے ہوئے تاری کا تو کیا میرا اپنا وجود بھی گم ہو جاتا ۔

مجھے تاریخ کی کتابیں پڑھنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ شاہجہاں کے بارے میں پڑھتے ہوئے میں دارا شکوہ کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ اشوک عظیم کی فتوحات کی تفصیل پڑھتے ہوئے میری سوچ کالنگا کی لڑائی پر رُک جاتی تھی۔ لاکھوں لوگوں کی لاشیں آکر میرے روبرو کھڑی ہو جاتی تھیں۔ تقسیم وطن کا خیال میرے ذہن میں قتل و غارت، لُوٹ مار اور جلتے ہوئے گھروں کی فلمیں دکھا دیتا تھا۔ ... تب کتاب میرے ہاتھوں سے گر پڑتی تھی۔ میرا جسم پسینے سے بھیگ جاتا تھا۔

کتنے بڑے اتفاق کی فلمی سی بات ہے کہ گڑھی میں باپو تھا۔ پھر چاچا منگل داس آیا۔ پھر ماں اِندر کور آئی۔ پھر میں آیا۔ لیکن کسی کا بھی آپس میں خون کا رشتہ نہیں تھا۔ سب اپنا اپنا کردار ادا کر کے چلے گئے ... اب بھی سوچتے ہوئے وہ گڑھی کھنڈر میں پھر سے تعمیر ہو جاتی ہے۔ اس کے بڑے سے دروازے کے تختوں پر موٹے تیکھے کیل اور پتّیاں جڑی ہیں۔ اندر سے گھوڑیوں پر سوار باپو بکرم سنگھ جاگیر دار اور چاچا پنڈت منگل داس ہاتھوں میں بلّم لیے ہوئے 'کرو ٹس کرو ٹبیں' کی آوازوں کے بیچ نکلتے ہیں۔ گھوڑوں کے سُموں کی آوازوں اور ہتھیاروں کی چمک سے میں سہم جاتا ہوں۔ ماں مجھے گود میں لے کر اندر گھس جاتی ہے۔ ... باپو باہر نیم کے پیڑ کے نیچے موٹے پایوں والی چارپائی پر بیٹھا مونچھیں مروڑ رہا ہے۔ چاچا اندر صحن میں مُرغ کی گردن مروڑ رہا ہے۔ ماں مجھے ان کے نزدیک نہیں جانے دیتی ...

تب میں اور تاری کمرے سے نکل کر اڈّہ والا چوک پار کر کے گوبند رام کے ڈھابے پر جا کر بیٹھ جاتے تھے، جہاں غیر شادی شدہ پروفیسر کپور بھی آیا کرتا تھا۔ وہ اور تاری مسافر عورتوں کو تاڑتے رہتے تھے، اور میں بیٹھا سوچتا رہتا تھا کہ یہ تاریخ کیوں لکھی جاتی ہے؟ یہ مضمون کیوں پڑھایا جاتا ہے؟ ... یہ سوالات میرے اندر نفرت بھر دیتے تھے۔

یہی سوالات میں پروفیسر کپور سے پوچھتا تو وہ تیکھی نظر سے مجھے دیکھتا۔ سوچتا ہوا کہتا ... "اس لیے کہ ہمیں خبر ہو کہ ہمارے پُرکھے کون تھے، وہ کیا کرتے رہے ... ہماری جڑیں کس دھرتی اور کس کلچر میں ہیں ... دیکھو ... تواریخ کسی قوم کو ویسے ہی سنبھال کر رکھتی ہے جیسے سمندری جہاز کو لنگر ... یہ نہ ہو تو جہاز ڈوب جائے۔"

جواب سن کر میں چپ ہو جاتا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ جہاز تو ڈوب چکا ہے۔ ہم اسی بھرم میں ہیں کہ وہ تیر رہا ہے... پھر خیال آتا کہ شاید میں ہی پاگل ہوں۔ لوگ بھلے چنگے بستے ہیں۔ پیٹ بھر کر کھاتے، جی بھر کر سوتے اور بڑے شوق سے نئی نسلیں تیار کرتے چلے جا رہے ہیں۔ مجھے ہی کچھ ہو گیا ہے۔ تبھی تو مجھے نہ گاؤں میں اپنا گھر اچھا لگتا ہے اور نہ ہی شہر کا یہ کمرہ... پتہ نہیں میں نے چھوٹی عمر میں کیا دیکھ لیا تھا؟ کیا سن لیا اور کیا سوچ لیا تھا؟ جس سے میرے اندر کوئی دکھ جم کر رہ گیا تھا۔ جو کسی بھی حیلے پگھلتا ہی نہیں تھا۔

چھوٹا تھا تو آٹھ برس تک اپنی ماں کے پلّو سے بندھا رہا تھا۔ باپو کی دہشت ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس کی بات سنتا ہی تھا، جواب نہیں دیتا تھا۔ اسے مجھ پر زیادہ ہی پیار آتا تھا تو بازار لے جاتا تھا۔ قیمتی کپڑے اور بوٹ لے دیتا تھا۔ میں اس کی انگلی پکڑ کر نہیں چلتا تھا۔ اس کے قاتل ہونے کا جو خوف لوگوں کے دلوں میں تھا وہ پتہ نہیں کیوں میرے دل میں آ کر بیٹھ گیا تھا۔

میں کچھ سوچنے سمجھنے لگا تھا تو پتہ چلا تھا کہ باپو نے بیس ایک برس پہلے ایک خاندان کے تین افراد قتل کر دیئے تھے۔ جس کی بنا پر اسے بیس برس کی قید بامشقت کی سزا ہو گئی تھی۔ اس زمانے میں ریاست نابھ میں بیس برس کی قید کا مطلب پورے بیس برس جیل میں گزارنا ہی تھا۔

مجھے باپو کے بڑے بڑے بھاری ہاتھ۔ موٹی انگلیاں، بڑے چہرے پر گھنی داڑھی اور موٹی موٹی آنکھیں اچھی نہیں لگتی تھیں۔ کیش دھاری چاچا پنڈت منگل داس جیل میں اس کا پگڑی بدل بھائی بن کر ساتھ میں آیا تھا۔ وہ دونوں مل کر اچھے برے کام کرتے تھے۔ مگر چاچا سے مجھے ڈر نہیں لگتا تھا۔ میں اس کے کندھوں پر چڑھ کر کھیلتا رہتا تھا۔ قد اور ڈیل ڈول میں وہ باپو سے بھی بڑا تھا۔ مگر اس کے بولنے اور دیکھنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ میں اس کی طرف کھنچ جاتا۔ دنیا جہان کی کتھا کہانیاں وہ جانتا تھا۔ باپو تو شراب میں مدہوش ہو کر گالیاں دیتا تھا۔ وہ گر کر ادھ ننگا ہو جاتا تھا تو اسے چاچا اٹھاتا تھا۔ گھر۔ گھر ڈھور ڈنگروں کی دیکھ بھال کے لیے رکھا ہوا تھا۔

لوگوں کو ڈرانے والے وہ دونوں باپو اور چاچا میری ماں سے ڈرتے تھے۔ وہ سامنے آتی تھی تو وہ گالیاں دینے سے رک جاتے تھے، ماں کی خوبصورتی اور آنکھوں میں پتہ نہیں کیا تھا کہ گاؤں بھر کی عورتیں اسے 'بی بی' کہتی تھیں۔ گھر میں ماں ہوتی تھی تو میں بے خوف ہوکر کھیلتا تھا۔ وہ مجھے دنیا بھر کی عورتوں سے خوبصورت لگتی تھی۔ کتنی عمر تک میں اس کے ساتھ ہی سوتا رہا تھا... وہ نہاتی تھی تو میں دہلیز پر بیٹھا رہتا تھا۔ وہ نہا کر گیلے بال سکھاتی ہوئی یا سر ڈھانپ کر گڑھی کے اندر ہی بنے مندر میں پُوجا کرتی تو میں اس کا دامن تھامے رکھتا تھا۔ اندھیرے میں اس کے بدن کی خوشبو سے اسے ہاتھ لگا کر پہچان لیتا تھا۔ اس کی پرچھائیں کی چال سے ہی جان لیتا تھا۔

ماں کا انتقال ہوا تو میں کالج میں پڑھتا تھا۔ اس نے آخری وقت میں اُن کچھ باتوں کی تصدیق کر دی تھی جو میں نے لوگوں سے سُنی تھیں۔ انھیں پختہ یقین میں بدل دیا تھا مالیر کوٹلے والی ماسی رحمتاں نے... یہ دُکھ بھری بات اس نے ہی بتائی تھی کہ میں ماں اِندر کور کی کوکھ سے جنما بیٹا نہیں ہوں۔ میری اصلی ماں پاکستان میں رہتی ہے۔ میرا ننہال راجستھان کے اس گاؤں میں ہے جہاں میری ماں پھر کبھی نہیں جا سکی۔

یہ سب کچھ میرے ساتھ ہی کیوں ہوا تھا؟... اس سوال نے میری سوچ کو اُلجھا کر گتھّی سا بنا دیا تھا... خود کو اس ذہنی کیفیت میں سے نکالنے کے لیے اس کمرے میں مَیں ایک تانترک کی بتائی ہوئی کِریا (عمل) کیا کرتا تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں پردے کی آڑ میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتا۔ اپنے آگے رکھے ہوئے ٹرنک پر وہ انسانی کھوپڑی رکھ لیتا جو اس سادھو نے مجھے دی تھی۔ اس کے آگے دِیا جلا لیتا۔ پھر منتر کا جاپ کرتا رہتا۔

لیکن میری سوچ سلجھنے کی بجائے زیادہ اُلجھ جاتی۔ موت کا مقابلہ کرنے کے لیے شکتی پیدا کرنے والی کُنڈلی جاگرت نہ ہوتی، بلکہ کہیں گُم ہو جاتی۔ میں چپّل اٹھاتا اور دھائیں دھائیں کر کے کھوپڑی پر جڑ دیتا... میں غصّے اور نفرت سے بھر جاتا۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ کھوپڑی میرے پُرکھوں کی ہے۔ جنھوں نے مجھے لہُو سے لت پت تاریخ دے کر اس حالت میں لا دیا ہے۔

اس رات مجھے بہت بھیانک خواب آتے۔ مجھے گھر جلتے ہوئے اور انسان قتل کیے جا رہے

دکھائی دیتے۔ حملہ آور گڑھی پر ہلّہ بول دیتے۔ وہ باپو کو کاٹ دیتے۔ چاچا کو اٹھا کر کنوئیں میں پھینک دیتے۔ گڑھی کے پیچھے والے صحن اور کوٹھڑیوں کی زمین کھود کر لاشیں نکالتے۔ جن کو دیکھ کر میں اور ماں بڑے کمرے میں چھپ جاتے۔ وہ ہمیں پلنگ کے نیچے سے کھینچتے۔ ان کے رنگ کالے اور چہرے بھیانک ہوتے اور ہاتھوں میں بے ڈھنگی سی تلواریں ہوتیں۔ وہ مجھے ٹانگ سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے ماں سے الگ کر لیتے۔ میری چیخیں نکل جاتیں۔

آنکھ کھلتی تو میرا دل اچھلتا ہوتا۔ بدن پسینے سے شرابور ہوتا... تاری میری چارپائی پر پانی لیے بیٹھا ہوتا۔ اس کو میں اپنے ڈرنے کی بات بتاتا۔ مگر یہ نہ بتاتا کہ دہشت کے مارے منی خارج ہو گئی تھی... مجھے ڈر تھا کہ تاری طعنہ دے گا کہ 'انگوٹھا چوس' ہی رہا نہ ماں کا لاڈلا۔

موسم قدرے ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ پھر بھی مجھے پیاس لگتی ہے تو بوتل میں سے دو گھونٹ بھر لیتا ہوں۔ ٹرین کے ہچکولوں کے سبب لکھنا دشوار ہو رہا ہے۔ تو بھی ایسا لکھا ہی جا رہا ہے کہ میں پڑھ سکوں... باپو نے میرا نام رام سنگھ رکھا تھا۔ لیکن چاچا منگل داس کے بتانے پر اسکول میں رام چندر سنگھ ہی لکھا گیا تھا۔ مگر ماں مجھے ہمیشہ 'رام جی' کہہ کر پکارتی تھی۔ وہ بہت دھارمک عورت تھی۔ وہ برت رکھ کر بہت دیر تک پاٹھ پوجا کرتی رہتی تھی۔ وہ ایسا کیوں کرتی تھی؟ اس کا راز چاچا منگل داس نے ماں کے انتقال کے بعد مجھے بتایا تھا۔ وہ یہ کہ اندر کور دوسرے دلیس کی تھی (پنجاب کی نہیں تھی) اُسے میرا باپو شادی کر کے نہیں لایا تھا۔ اُسے چاچا منگل سری گنگانگر سے اس وقت لایا تھا جب وہ میرے باپو کے کہنے پر زمین خریدنے کے لیے مناسب جگہیں دیکھنے گیا تھا۔ وہاں اِندر دئی اُسے ایک سرائے میں ملی تھی۔ ٹھاکروں کی اس لڑکی کو کوئی نوجوان ورغلا کر لا کر وہاں چھوڑ گیا تھا۔ وہ اپنے گھر لوٹتی تو اس کے باپ کی طرف سے اسے کاٹ کر زمین میں گاڑ دینے کا ڈر تھا۔ پنڈت منگل داس کے ساتھ چلنے میں اسے اپنا بھلا دکھائی دیا ہوگا۔

گاؤں آنے پر باپو نے گوردوارہ میں اس کے ساتھ بیاہ کر لیا تھا۔ وہ اِندر دئی سے بی بی اندر کور ہو گئی تھی۔ سارے گاؤں میں مٹھائی بانٹی گئی تھی۔ پھر بھی ہماری ذات کے

جاٹوں کے گھروں کے بڑے لوگوں نے روٹی بیٹی کی سانجھ تسلیم نہیں کی تھی۔ سانجھ پیدا کی تھی ماں کی دانشمندی اور شیریں زبانی نے... باپو عمر میں ماں سے قریب بیس برس بڑا تھا۔ کیش اور داڑھی رنگتا تھا۔ گاؤں کے بیشتر لڑکوں کا وہ تایا تھا۔ ماں کو چھوٹی عمر میں ہی تائی بننا پڑ گیا تھا۔ اُسی کے سبب گاؤں کی عورتیں گڑھی میں آنے جانے لگی تھیں۔ اس کے انتقال کے بعد عورتوں کا آنا بند ہو گیا تھا...

ماں کے انتقال کے بعد میرا رونا بند نہ ہونے کے سبب باپو اور چاچا نے ماس کھانا بند کر دیا تھا۔ مگر جب چاچا گھر کا کام کاج مگھر پر چھوڑ کر مندر میں پاٹھ کرنے لگ گیا تھا تو باپو بے تحاشہ شراب پی کر دیواروں سے ٹکراتا رہتا تھا۔ وہ کبھی پرماتما کو گالیاں دینے لگتا تھا اور کبھی سورج، چاند، دھرتی، آسمان، ناگ دیوتا، خواجہ پیر اور پتہ نہیں کس کس کی جے کے نعرے لگاتا رہتا تھا۔ آخر کار تان میں آٹھ کر گور دوارے جا کر دیگ بھی کر آتا تھا... ’کاہے کو جنما ماں نے پُوت... بڈّھا ہونے کو... جموں (ریموں) کی ماں کی پھر... ر... ر۔

میں شہر سے بے زار ہو کر اُلجھا ذہن لے کر گاؤں گیا تھا۔ دیکھا باپو بہت بیمار تھا۔ کچھ کھا پی نہیں سکتا تھا۔ گلا پک کر بُھٹّا ہو گیا تھا۔ نزدیک کے سرکاری ہسپتال سے جواب مل گیا تھا۔ رنگ کے بغیر اس کے کیش اور داڑھی کے بال پٹ سَن کے لچھّے سے بن گئے تھے۔ میں رات کو اُس کے پاس بیٹھا رہا تھا۔ وہ مجھے لگاتار تکتا رہا۔ پھر دیواروں کی طرف اشارے کرتا رہا تھا۔ جیسے دادا کی اُس تلوار کی طرف نظر اٹھا رہا ہو جو دیوار پر ٹنگی تھی۔ چاچا اُس کی منہ کی جوٹھن کو پونچھتا ہوا کچھ اور ڈالنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔

تڑکے چاچا کی چیخ سنائی دی تو میں سمجھ گیا تھا۔ کچھ دیر انجان بنا لیٹا ہوا سوچتا رہا تھا۔ اس دُکھ کو محسوس کرنے لگا تھا جو ماں کی موت کے وقت ہوا تھا۔ مگر اس کا احساس نہیں ہوا تھا۔ میں اُٹھ کر اس کمرے میں گیا تھا۔ چاچا جب مجھے اپنی باہنوں میں بھر کر رویا تھا تو میں بھی رویا تھا۔ مگر بعد میں محسوس ہوا تھا کہ گھر میں ہوئی موت کو برداشت کرنا کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ دل پتھر کا سا ہو گیا تھا۔ ایسا کیوں ہوا تھا؟ میں سمجھ نہیں سکا

تھا۔ سمجھ میں تو اور بھی کئی باتیں نہیں آتیں ۔ جیسے یہ کہ مجھے گاؤں کی شمشان بھومی کے نزدیک دوسرے گاؤں کے قبرستان میں رہنے والا وہ فقیر کیوں اچھا لگتا ہے، جو شام کے دھند لکے میں بھیک مانگنے کے لیے آتا ہوا یہ گاتا ہے ... 'پلّے رزق نہ باندھتے ، پنچھی اور درویش '۔

بات وہ بھی سمجھ میں نہیں آئی تھی جب اپنی اصلی ماں کو ملا تو بھی میرے اندر پیار بیدار نہیں ہوا تھا ... ماسی رحمتاں مجھے چوری چھپے پاکستان لے گئی تھی، جہاں میری ماں جبیناں میرے دوسرے باپ کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ پورے اکیس برسوں سے مجھے ملنے کے لیے تڑپتی رہی تھی ... جہاں ہم گئے تھے وہ ہمارے گاؤں جیسا ہی گاؤں تھا۔ تاری کی ماں جیسی ماں مجھے اپنی باہوں میں لے کر بہت روئی تھی۔ اس کی آہ وزاری سے وہ لوگ بھی روئے تھے۔ باپ نے بھی بغلگیر ہو کر محبت کا اظہار کیا تھا۔ مجھ سے بڑا میرا سگا بھائی میرے پاس بیٹھا مجھے دیکھتا رہا تھا ... مگر میرے دل میں کیسی کے لیے بھی محبت بیدار نہیں ہوئی تھی۔ دل یوں ہی بھیگ کر سوکھ گیا تھا۔ میں تو پیٹ بھر کر روٹی بھی نہیں کھا سکا تھا۔ چاروں طرف پکتے گوشت کی باس تھی۔ ماں میرے بارے میں بہت کچھ پوچھ کر جب سونے کے لیے چلی گئی تو میں سوچتا رہا تھا ... 'میں کون ہوں؟ میرا مذہب کیا ہے؟ میرا وطن کہاں ہے؟

میرے پاس کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔ میری سوچ مزید اُلجھ گئی تھی۔

کمرے میں آکر میرے آدھے سر میں درد رہنے لگا تھا۔ کھوپڑی کے پچھلے حصّے میں ٹیسیں اُٹھتی تھیں۔ آنکھوں کے سامنے سیاہ چھلّے سے ناچتے تھے۔ رات کو کوئی لکیر سی کھوپڑی کے ایک حصّے سے اُٹھ کر دوسرے حصّے میں سے گزرتی نکل جاتی تھی۔

ٹرین رک گئی ہے۔ کوئی بڑا اسٹیشن ہے۔ چائے کی طلب ہوئی ہے۔

سکورے میں چائے پیتے ہوئے باہر دیکھنا اچھا لگتا ہے ... جب سیاہی مائل رنگ کے بہت سے لوگ دکھائی دینے لگیں تو سمجھو دکن دیس آگیا۔

باپو کے سورگباس ہونے پر چاچا نے بہت سوگ منایا تھا۔ اس نے سر منہ مُنڈوا کر چوٹی رکھ لی تھی۔ جیسے کہ ہندو اپنے باپ کی موت کے بعد 'کرمی دھرمی ' (مذہبی رسومات ادا کرنے

والا) بیٹھتا ہے۔ وہ گیتا پڑھتا ہوا مجھے بھی سمجھاتا رہتا تھا کہ کیسے آتما ایک چولا چھوڑ کر دوسرا پہن لیتی ہے... مجھے اس کی تمام باتیں غیر ضروری سی لگتی تھیں۔

اس کی ایک بات پر مجھے بہت حیرانی ہوتی تھی کہ اُسے اپنے کیے کسی بھی اچھے بُرے کام کا پچھتاوا نہیں تھا۔ وہ یہ کہہ کر سُرخرو ہو جاتا تھا کہ... 'یہ سب رام کی لیلا ہے، ہم تو مٹی کے پتلے ہیں بس مٹی، مٹی سے کھیلتی ہے۔ کھلونوں کی ڈور تو اوپر والے کے ہاتھ میں ہے... کیا رام چندر جی کو پتہ نہیں تھا کہ ہرن سونے کے نہیں ہوتے... ماتا سیتا، راون کے پاس رہ کر بھی پوتر تھی۔ پھر بھی اگنی پریکشا لی گئی... بھگوان کرشن خود چھلیا بنے۔ کیا انھیں پتہ نہیں تھا اپنے انجام کا؟ مہابھارت کے یُدھ کا؟... پھر ہم تو بھئی عام آدمی ہوئے، گناہوں سے بھرے۔

اس کی باتوں میں میرا دھیان ٹھہرتا نہیں تھا... میں تو اور ہی سوچوں میں گُم تھا۔ مجھے اس دھرتی کی تاریخ، یہاں پیدا ہوئے انسان کا نصیبہ، بدحالیوں میں جیتے اور چیونٹیوں کی طرح مرتے لوگ... اور میری زندگی کا مقصد کیا ہے، جیسے سوالات نے گھیر رکھا تھا۔

... مجھے لگتا تھا کہ اس دھرتی پر کورکشیتر سے لے کر پانی پت کے میدانِ جنگ تک، پھر ۱۹۴۷ء کے فسادات سے لے کر بھونڈی کے چھوٹے فسادات تک... ہر ایک اِنچ زمین پر انسانی خون بکھرا پڑا ہے۔ یہاں زمین کی تین اِنچ میڈھ اور ایک روپے کے لیے انسان قتل کر دیئے جاتے ہیں... اگر یہی ہمارا نصیبہ ہے تو پھر یہ سارے دھرم گرنتھ کس کام کے؟... یہ دنیا جسے ہم اتنے لاڈ چاؤ سے دیکھتے ہیں، ایک دن کاٹی بیٹی اور جلائی جائے گی۔ تمام شہر اور گاؤں کھنڈر ہو جائیں گے... بارہ کوس دِیا جلے گا... پھر ہڑپا، مہنجوڈرو اور سنگھول کی طرح کھدائی ہوگی۔ لکھنؤ، لدھیانہ، جالندھر اور چنڈی گڑھ ملیں گے۔ پھر تاریخ لکھی جائے گی۔ اسکولوں، کالجوں میں پڑھائی جائے گی... اور پھر... ہم تاریخ کیوں پڑھتے ہیں؟ کیا یہ ماننے کے لیے کہ ہمارے پُرکھوں نے اتنے مظالم ڈھائے اور سہے... ہم حرام کی اولاد ہیں۔ ہم ایک عورت کو پانچ افراد مل کر استعمال کرتے ہیں۔ اُسے جوئے میں ہار کر بھرے دربار میں ننگی کرتے ہیں... کیا یہی جڑیں ہیں ہماری، جن کی بات پروفیسر کپور کہا کرتے تھے۔

ایسے ہی خیالات کے ساتھ میں باپو کے پھول (استھیاں) گنگا میں ڈالنے کے لیے ہری دوار

چلا گیا تھا۔ کنکھل میں پھول جل پرواہ کر کے میں ہر کی پوڑی پر اسنان کر کے اس جگہ کھڑا تھا جہاں سے ایک طرف مندر دکھائی دیتا تھا اور دوسری طرف گوردوارہ۔ سورج نیچے جا رہا تھا۔ چاروں کھونٹ سے آئے دکھوں کے مارے لوگ گنگا جل سے پوتر ہو رہے تھے۔ وہ دکھ دھونے کی کوشش میں تھے۔ میں صبح کا بھوکا تھا... جب میں دکانوں کے نزدیک آیا تو میرے اِرد گرد بھکاری پھر رہے تھے۔ پتہ نہیں میرے من میں کیا آیا کہ میں لنگر لگوانے والوں کے پاس گیا۔ اپنے سارے روپے نکال کر لنگر کے لیے دے دیئے۔ میرے تھیلے میں جو بھی کپڑے تھے، نکال کر بھکاریوں میں بانٹ دیئے۔ پھر گھاٹ پر گھومتا رہا، ہلکے جسم اور ہلکے دماغ و دل سے...

شام کو بھوک نے بے حال کر دیا تو بے سُدھ سا ہونے لگا۔ جب قدرے ہوش میں آیا تو میں اُس جگہ کھڑا تھا جہاں لنگر تقسیم ہو رہا تھا۔ میں ایک قطار میں تھا۔ میرے آگے پیچھے کشکول لیے بھکاری کھڑے تھے...

پھر پتہ نہیں کب تک میں نیم بے ہوشی کی حالت میں رہا تھا۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں... میں بھٹکتا گھومتا رہا تھا۔ مندروں، آشرموں اور مٹھوں میں... مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون سا دیس تھا، کون سا گاؤں اور کون سے لوگ... اور میں کون تھا؟ انسان یا انسان اور حیوان کے درمیان کی کوئی تخلیق؟

ایک جین مندر میں مَیں نے ایک جین سادھو کو سنتھارا کرتے ہوئے دیکھا۔ اُس نے ایک ماہ سے اَن جل کا تیاگ کر رکھا تھا۔ سادھو کا جِسم سوکھ رہا تھا مگر چہرہ روحانی نُور سے چمکتا تھا۔ میرا بھی دل کیا کہ سنتھار کر کے زندگی ختم کر دوں... مَیں نے ان کا آخری ویاکھیان سُنا، مگر وہ مجھے کسی بھی کنارے نہ لگا سکا۔ جو بات مجھے اُڑا کر وہاں لے گئی تھی، وہی بھگا کر وہاں سے لے گئی تھی۔

اب مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔ اتنا یاد ہے کہ مَیں کہیں اکیلا بیٹھا تھا۔ مجھے لگا تھا کہ میرے بدن کو آگ لگ گئی ہے۔ جس کی لپیٹ کبھی کسی طرف سے نکلتی اور کبھی کسی دوسری طرف سے۔ میں اپنے کپڑے پھاڑ پھاڑ کر پھینکنے لگا۔ بہتے پانی میں کود پڑتا تھا۔ جسم پر گارا ملنے

لگ جاتا تھا... اس حالت میں کوئی مجھے اس ہسپتال میں چھوڑ گیا تھا۔ جہاں ڈاکٹر جیمز نے میرا علاج کیا تھا۔ ہمارے وارڈ کی نرسوں کی انچارج ولی اماں تھی۔

وہ ہسپتال یسوع نگر میں تھا۔ وہ کوئی گاؤں یا قصبہ نہیں تھا۔ پرانی ریاست میسور کی اس طرف کی سرحد کے دیہات کے باہر کی طرف انگلینڈ کی مشنری کا بسایا ہوا نیا نگر تھا۔ پختہ سڑک پر بنے ہفتہ وار بازار سے دو فرلانگ لنک روڈ پر جا کر پہلے ہسپتال آتا تھا۔ اس کی بائیں طرف انگریزی کے حرف 'سی' کی شکل کی رہائشی عمارت تھی۔ اس سے ذرا دُور شادی شدہ ملازمین کے کوارٹر، اسکول اور دو کانیں تھیں۔ دائیں ہاتھ لمبا چوڑا پارک تھا جس میں اینٹوں یا اینٹوں کے بھٹّے کی مٹّی سے سڑکیں اور پگڈنڈیاں بنی ہوئی تھیں۔ پارک کے آخر میں گرجا گھر تھا جو ہسپتال کے نزدیک ہی تھا۔ ہسپتال اور دیگر تمام عمارتوں کی سڑکیں گرجا گھر کے آگے مل جاتی تھیں... اس بستی سے پرے کچّے پہاڑ اور جنگل تھے۔ دور سے یہ سارا نظارہ بہت ہی بھلا لگتا تھا۔

میری صحت ذرا اچھی ہو گئی تھی تو پتہ چلا تھا کہ اسی ہسپتال کے مریض، نرسیں، ڈاکٹر اور دیگر خدمت گار۔ پتہ نہیں کہاں کہاں سے آئے ہیں۔ کچھ وہ ہیں جو بے سہارا ہیں۔ کچھ وہ ہیں جو ان کو سہارا دیتے ہیں اور کچھ وہ ہیں جو ایک دوسرے کا سہارا بن کر رہ گئے ہیں۔

بیشتر لوگ سیاہی مائل رنگ کے تھے۔ کچھ اینگلو انڈین تھے۔ دو انگریز تھے۔ میرا علاج کرنے والا ڈاکٹر جیمز تین چوتھائی انگریز لگتا تھا۔ اُس کا جسم چُست تھا۔ ہری ہری آنکھوں میں خلوص اور شرارت دکھائی دیتی تھی۔

مجھے کچھ ٹھیک سے معلوم نہیں کہ علاج کتنا عرصہ چلتا رہا تھا۔ اتنا یاد ہے کہ جسم میں جان آدھی تھی۔ چلنے پر ٹانگیں کانپتی تھیں۔ نظر کمزور ہونے کے سبب عینک لگ گئی تھی۔ داڑھی کے بال سفید ہونے لگ گئے تھے۔

ہسپتال کے اپنے وارڈ میں جب رات کے کھانے کی ٹرالی آتی تو ولی اماں میز کرسی پر بیٹھی کچھ لکھ رہی ہوتی۔ وہ خوراک کی فہرست چیک کرتی۔ ہر ایک کے دودھ، انڈے اور پھل کا خیال رکھتی۔ سب سو جاتے یا اونگھ رہے ہوتے تو میں تکیہ اونچا کر کے پڑھتا ہوتا۔ وہ

میرے پاس آکر نیند کے بارے میں پوچھتی اور گولی دے جاتی۔

ایک رات بہت وقت لگا کر اس نے میری کیس ہسٹری تیار کی۔ میری زندگی کے بارے میں ہر ایک بات اس کے لیے حیران کرنے والی تھی۔ ہنس کر اس نے پوچھا "یہ کوئی فلمی کہانی تو نہیں؟" پھر اس نے کالم پُر کیا تھا کہ مجھے کیا کچھ اچھا لگتا ہے؟ میں نے اُسے یسوع نگر کی کئی چیزوں کے نام لے کر کہا تھا۔ "اور ایک تم" یہ کہنے کی جرأت اسی نے دی تھی۔

وہ خوبصورت نہیں تھی۔ رنگ جامنی سا تھا۔ ہونٹ موٹے۔ ماتھا چوڑا۔ آنکھیں دائیں بائیں پھیلی ہوئیں۔ بدن سڈول۔ ہلکا میک اپ کرتی تھی۔ پھر بھی اچھی لگتی تھی۔ اچھی لگنے والی بات اس کی مسکراہٹ میں تھی؟ اس کے ہاتھوں کے چھونے میں تھی یا اس کی کھُل جانے والی آنکھوں میں؟ میں کچھ سمجھ نہیں سکا تھا۔ لیکن ایسا کچھ ضرور محسوس ہوتا تھا کہ اس میں ماں اندر کو رجیسا کچھ ہے۔ جو جبر کر کے مجھے اس کے ساتھ جوڑتا تھا اور جوڑے رکھتا تھا۔

شام کو چھٹّی کر کے ولی اماں مجھے سہارا دے کر باہر سیر کے لیے لے جاتی تھی۔ ہم آہستہ آہستہ چلتے ہوئے بستی میں سے نکل کر جنگل کی پگڈنڈی پر چلتے رہتے۔ چڑھائی آنے پر شورہ ملی زمین کے ٹیلے پر بیٹھ جاتے، جہاں گھاس بہت کم تھی۔ ہم اپنے اپنے علاقہ کے درختوں، پھولوں، بُوٹوں ان کی خوشبوؤں یا ڈنگر ڈھوروں اور پرندوں کے بولنے اور ان کی عمارتوں کے بارے میں باتیں کرتے رہتے... ولی اماں کو اپنے ماں باپ کے بارے میں کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ اُسے دُور کے کسی رشتہ دار نے پالا تھا۔ پھر یتیم خانے میں سے ہوتی ہوئی وہ کسی مشنری کے سہارے ہسپتال میں آئی تھی۔

شام کو وہ مجھے بازو کا سہارا دے کر گرجا گھر بھی لے جاتی تھی۔ باہر بڑھ رہے اندھیرے میں عقیدت مند آتے۔ اندر فانوس اور موم بتیوں کی روشنی میں آرگن پر دُھن بجتی۔ سامنے بھگوان یسوع مسیح صلیب پر لٹکائے دکھائی دیتے۔ دائیں طرف ماں مریم کی بڑی تصویر کے آگے بھی موم بتیاں جل رہی ہوتیں۔ ان کو اور عقیدت مندوں کو دیکھ کر اور بھگتی سنگیت کی دُھن سن کر دل میں ٹھنڈک پیدا ہوتی تھی۔ پھر مقدس بائیبل کھول کر ہم فادر غلام قادر کے ساتھ ساتھ پڑھتے تھے... 'مبارک ہیں وہ جو دُکھی ہیں...

کیونکہ انھیں تسلّی ملے گی ... مبارک ہیں وہ جو صحیح ہیں۔ کیونکہ وہ زمین کے وارث ہوں گے ...'

پھر دعا کی جاتی ...' اے خُدا! ہم تیرے بچّے ہیں۔ غلطی کرتے ہیں۔ تو بخشنے والا ہے۔ ہمارے قصور معاف کرنا۔ نیکی کی راہ دکھانا۔ ہمیں دُکھی اور بیمار لوگوں کی خدمت کی توفیق عطا کر ... آمین!'

سب کے دلوں میں سکون پیدا ہو جاتا۔ سب اپنی ڈوری کسی غیر مرئی طاقت کے حوالے کر کے مطمئن ہو جاتے۔ میرے دل میں کُھدا گڑھا ساویسے ہی رہتا۔ سورج کے غروب ہوتے ہی میرا جو دل گرنے لگتا تھا وہ اس وقت بھی بہت نیچا بیٹھا ہوتا۔

ولی اماّں مجھے اس کمرے میں چھوڑ جاتی ہیں جو ہسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد مجھے ملا تھا۔ میں کھڑکی میں بیٹھا پارک میں سیر کرتے ہوئے یا میرے کمرے کے دروازے کے سامنے سے گزرتے ہوئے لوگوں کو دیکھتا رہتا تھا۔ ان میں بے لوث خدمت کرنے والے بھی تھے۔ خدمت کے محتاج بھی تھے اور کوئی پوشیدہ غرض پوری کرنے کے لیے رہنے والے بھی تھے۔

جب میں صحت یاب ہو گیا تھا تو مجھے میڈیکل سٹور میں کام ملا تھا۔ پھر کچن کا انچارج بنا دیا گیا تھا۔ میں نے چاچا منگل کو چِٹھی لکھ کر خرچہ کے لیے رقم منگوا لی تھی۔ جسے خرچ کرنے کے لیے میں اور ولی اماّں شہر جاتے تھے۔ چوری سے فلم بھی دیکھ آتے تھے۔ کہاں جانا ہے؟ کہاں بیٹھنا ہے؟ اور کیا کرنا ہے؟ یہ فیصلہ میں نہیں کرتا تھا۔ ولی اماّں ہی کرتی تھی۔ میں تو بس بچّے کی طرح اس کی نظر کے اشارے پر کام کرتا رہتا تھا... پھر تو یہ بات ہو گئی تھی کہ اس کے بغیر کچھ وقت گزرنا بھی مشکل ہو گیا تھا ... اِن دنوں چُھٹّی والے دِن کی شام کے اندھیرے میں برستی بوندوں میں بھیگتے ہوئے پگڈنڈی پر چلتے ہوئے جنگل کے اُسی شور یلے ٹیلے پر جا کر بیٹھ گئے تھے۔ وہیں پیار کی ایک پوزیشن میں بیٹھتے ہوئے میرا پاؤں رپٹ گیا تھا۔ گھٹنے کی ہڈّی چٹخ گئی تھی۔ مہینے بھر مجھے اپنے کمرے میں ہی رہنا پڑا تھا۔ جہاں ساری دیکھ بھال ولی اماّں ہی کرتی تھی۔

ان دنوں وہ لمحہ آیا تھا جب میں نے پہلی بار وہ چیز دیکھی تھی جو تصویروں اور پتھر کی مورتیوں میں ہی دیکھی تھی ... بچوں کی طرح کھیلتے ہوئے میں نے ولی اماں کی بنڈی کے بٹن کھول دیئے تھے۔ اس نے غصے کا اظہار نہیں کیا تھا۔ یُونہی گھورتی رو کتی رہی تھی۔ جسم کے ان سڈول حصوں کا رنگ اس کے چہرے کی نسبت صاف تھا۔ درمیان میں گہرے لال رنگ کے گھیرے تھے۔ اور ان کے بیچ میں کشمش کے دانے گڑے تھے ... میں چاہتا ہوا بھی ہاتھ نہیں لگا سکا تھا ... پھر بے خبری میں میرے ہونٹ لگ گئے تھے ... پھر میری ذات میرے اندر ہی کہیں کھو گئی تھی ... جب وہ اندھیرے کنوئیں میں سے برآمد ہوئی تھی تو میری حالت ویسی ہی تھی جیسی بھیانک خواب دیکھ کر شہر کے کمرے میں نار ی کے ساتھ رہتے ہوئے ہو جایا کرتی تھی۔ میرا زیر جامہ پلید ہو گیا تھا۔ جسم بے جان ہو کر ڈھے گیا تھا۔

یہ حرکت مجھ سے کئی بار دوہرائی گئی تھی۔ ہر بار وہ مجھے پیار سے دلاسا دیتی سمجھاتی تھی ...

"خداوند یسوع مسیح نے کہا ہے ... 'بستر بے داغ رکھو۔ کیونکہ پرماتما بدکاروں اور حرام کاروں کی کچہری لگائے گا۔'"

میں بھی اس کے احساس گناہ سے ڈر جاتا تھا ... مگر اس سے بھی زیادہ ڈر گیا تھا ولی اماں کی اس نظر سے، جس سے وہ مجھے میرے پلید ہونے کے بعد دیکھتی تھی۔ اس کی وہ نظر دلاسے کے طور پر کہی گئی بات سے میل نہیں کھاتی تھی۔ وہ اس طرح دیکھتی تھی ... جیسے ٹوٹی ٹانگوں والی بلی مارنے کے لیے آئے آدمی کی طرف دیکھتی ہے۔ جیسے کوئی مریل سا کتا کسی تنومند کتے کی ٹانگوں کے نیچے پڑا دیکھتا ہے۔ جیسے چوٹ کھائی ناگن تکتی ہے۔

خود کو بے بس سا محسوس کرتا میں دھرتی میں گڑا سا محسوس کرتا تھا۔ نظریں جھکا لیتا تھا۔ دل کرتا تھا کہ وہاں سے کہیں بھاگ جاؤں۔

جب ڈاکٹر جیمز ولی اماں کی طرف زیادہ ہی توجہ دینے لگے تھے تو میرے اندر مشکل سی کوئی کروٹ لیتی محسوس ہوئی تھی۔ مگر اس شرمساری سے بچنے کا راستہ نکلنے کی راحت بھی تھی ... پھر ان کی شادی ہوئی تھی تو پارٹی کا انتظام میں نے خود کیا تھا۔ ساتھ گیا تھا گرجا گھر میں۔ ولی اماں نے مجھے اور جیمز کو دائیں بائیں کھڑے کر کے فوٹو کھنچوائی تھی۔ میں نے شراب بھی

پی تھی۔ لیکن اس رات اپنے کمرے میں اس طرح گزار رہی تھی جیسے کوئی زندہ شخص مردہ گھر میں پڑا رہے ... مجھے اُسی طرح کا کچھ چھِن جانے کا احساس ہوا تھا جیسے ماں کی موت پر ہوا تھا۔

ولی اماّں چاہتی تھی کہ شام کو میں ان کے ساتھ سیر کو جاؤں۔ مگر میں چھُپ جاتا تھا۔ اپنے کمرے کی کھڑکی میں بیٹھ کر انھیں جاتے دیکھتا رہتا تھا۔ اندھیرا ہونے پہ گرجا گھر کی سیڑھیوں پر اندھیری جگہ بیٹھ کر ان کو پارک میں گھومتے ہوئے دیکھتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی وہ باتیں کرتے ہوئے اور ہنستے ہوئے میرے نزدیک سے گزر جاتے تھے۔ ولی اماّں تو جیسے لال پری بن کر اُڑتی پھرتی تھی۔ وہ مجھے ڈائننگ ہال میں پکڑ لیتی تھی۔ وہ دونوں میری اس میز پر آ بیٹھتے تھے۔ جہاں میں ہر روز بیٹھا کرتا تھا۔ وہاں سب لوگ نہا دھو کر اور بڑھیا کپڑے پہن کر آتے تھے۔ ولی اماّں کا لباس شوخ رنگ کا ہوتا تھا اور وہ خوب میک اَپ کر کے آتی تھی ... مَیس میں سیلف سروس تھی۔ پھر بھی وہ جیمز کے ساتھ جا کر میرے لیے بھی تھالی اٹھا لاتی تھی۔ میں خاموشی سے کھانا کھاتا رہتا تھا۔ جیمز لطیفے سُناتا تھا۔ ولی اماّں ہنستی تھی۔ بے فکر نوجوان اور لڑکیاں ہاتھ ملاتے تھے۔ جملے کستے تھے اور ایک دوسرے کی طرف فلائنگ کِس پھینکتے تھے۔ ہنستے تھے۔ بمبئی کی فلمی دنیا سے بھاگ کر آئی نندنی پار کر مذاق کرتی ہوئی میرے سر پر ہاتھ پھیر جاتی تھی۔ جیمز مجھے کہتا تھا کہ میں پارکر سے شادی کر لوں۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ نندنی جو کچھ کہتی ہے وہ کچھ اور ہے۔ اور اس کے دل میں کچھ اور ہے۔ کیمپس میں ناٹک کھیلنے والی زندگی میں بھی ایکٹنگ کرتی ہی دکھائی دیتی تھی۔

ایک روز ولی اماّں نے مجھ سے کافی بڑی رقم کی مانگ کی۔ میں اُسی رات ٹرین پکڑ کر اپنے گاؤں کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ کچھ روپے بنک میں سے نکلوا کر ایک اور ایکڑ زمین فروخت کر کے میں نے رقم اس کے حوالے کر دی تھی۔ جیسے وہ نوٹ نہ ہوں۔ فقط کورے کاغذوں کا ایک بنڈل ہو۔

جب میں گاؤں آیا تو سب کچھ بدل چکا تھا۔ چَوماسا چھاجوں برسا تھا۔ گاؤں میں سیلاب آیا تھا۔ ہریجنوں کی آبادی کے کچّے مکان گر گئے تھے۔ گڑھی کے پچھلے حصّے میں بنی کوٹھڑیوں کی دیواروں میں دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ مویشیوں اور بھُوسے والے کمروں کا بڑا اشتہیر

ایک طرف کو جھک گیا تھا۔ ... ہریجن اپنے مکانوں کی تعمیر پھر سے کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ گاؤں کے لوگ پختہ دیواریں بنا رہے تھے... مگر جوہڑ کے اس پار رہنے والے خانہ بدوش کینچولے اور سانپ کھا کھا کر بڑے آرام میں تھے۔

چاچا بہت تیزی سے بوڑھا ہو گیا لگتا تھا۔ وہ کمر کے درد کے سبب کبڑا ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں ہمیشہ بھیگی سی رہتی تھیں۔ اس کی نظر بھکاریوں کی طرح دیکھتی تھی۔ جیسے کسی بات پر پچھتا رہا ہو۔ اُسے بدروحیں دکھائی دینے لگی تھیں۔ ان مردوں عورتوں اور بچّوں کی بدروحیں چھت اور درختوں پر بیٹھا دکھائی دیتی تھیں جنھیں اس نے باپو کے ساتھ مل کر قتل کیا تھا۔ اس کی آنکھوں کی پلکوں کے بال جھڑ گئے تھے۔ اُسے نرک کُنڈ کا ڈرا اور دھرم کے کاموں کا خیال آنے لگا تھا... وہ مجھے کھانا پروس کر میرے سامنے بیٹھ کر گڑگڑایا تھا کہ میں اب وہاں سے نہ جاؤں۔ شادی کرا لوں۔ اتنی زمین جائیداد ضائع جانے سے بچا لوں... اُسے اپنے مردے کی بے حرمتی ہونے کا ڈر بھی تنگ کرنے لگا تھا۔ دیوار کی دیوار سا وہ آہنی شخص تسلا بھر گارا بن گیا تھا۔

گاؤں میں تاری ملا تو میں اسے دیکھ کر حیران ہوا تھا اور وہ مجھے دیکھ کر۔ وہ بہت موٹا تگڑا اور خوش پوش ہو گیا تھا۔ نزدیکی گاؤں میں کالج کھلا تھا۔ اور وہ وہاں تاریخ پڑھاتا تھا... میں اس کے سامنے کمزور سا، عینک والا اور ہاتھ میں چھڑی تھامنے والا بوڑھا تھا جس کی داڑھی ٹھڈی پر سفید ہو گئی تھی۔ میری ٹانگ تو اب ٹھیک تھی مگر چھڑی پکڑ کر چلنے کی عادت سی بن گئی تھی۔

میں نے چاچا اور پروفیسر اوتار سنگھ کے ساتھ مشورہ کر کے گڑھی کے پچھلے حصّے کی کوٹھڑیوں اور کوٹھوں کی چھتوں اور دیواروں کا جو بھی حصّہ کام کا تھا ہریجنوں کی بستی والوں کو اٹھوا دیا۔ وہ کئی سو برس پرانی سرہندی اینٹیں بھی اٹھا کر لے گئے۔

ایک رات میں نے تاری سے پوچھا "کیوں بھئی زمین کس کی ہوتی ہے؟ ... اب کہو نہ وہی بات کالج والی ... کہ زمین اُس کی جو کاشت کرتا ہے۔" وہ ہنس دیا۔ اب وہ خود تو کاشت نہیں کرتا تھا مگر زمین کا مالک بنا ہوا تھا۔ پھر میں نے اس کے باپو کو بلا کر دو ایکڑ زمین اپنی کم شرح

پر بیچ دی تھی ... تب مجھے باپو کے پرانے ٹرنک میں سے کچھ کاغذات کی تلاش تھی - انھیں دیکھ کر میں حیران ہوا تھا - باپو نے میرا جنم ماں اندر کور کی کوکھ سے ہونے کا جھوٹا سرٹیفکیٹ بھی بنوایا ہوا تھا - زمین جدّی تھی اور کوئی وارث نہیں تھا - وصیت کے مطابق باپو کے بعد اس کی وارث ماں اندر کور تھی - پھر میں تھا - اس چار ایکڑ زمین کا مالک چاچا منگل داس تھا جو شمشان بھومی کے ساتھ لگتی تھی - بارانی فصل والی زمین تھی وہ -

اتنی بھاری رقم لے کر اور چاچا اور تاری کو جلد لوٹ آنے کا دلاسا دے کر میں یسوع نگر چلا گیا تھا - ولی اماں کو ساری رقم پکڑا دی تھی - جیسے نوٹ نہ ہوں ردّی کا غذ ہوں - پیار سے اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے تھے - اس نے مجھے باہوں میں بھر لیا تھا - چوم لیا تھا -

مگر جب دوسری بار میں گاؤں سے لوٹ کر یسوع نگر گیا تھا تو ولی اماں اور ڈاکٹر جیمز وہاں سے جا چکے تھے - کسی کو بھی ان کی کوئی خبر نہیں تھی ... تب مجھے خیال آیا تھا کہ ولی اماں نگر کے منتظمین کی نکتہ چینی کیوں کرنے لگی تھی - اسے تمام مشنری خود غرض کیوں دکھائی دینے لگے تھے - اس نے بڑی سنجیدگی سے ایک بار مجھے کہا تھا - " بائبل میں عورت کو بُرا کہا گیا ہے - لکھا ہے ... خُدا نے عورت کو کہا ... میں حمل کے درد کو بہت بڑھا دوں گا - تُو درد سے بچّے جنے گی ... تیری محبت تیرے خاوند کی طرف رہے گی - وہ تجھ پر حکومت کرے گا ... خُدا نے عورت کو مرد کے تابع کیا ہے - "

وہ مجھے دھوکا دے گئی تھی - پھر بھی مجھے بُری نہیں لگی تھی -

چند روز یسوع نگر میں رہ کر میں گاؤں آگیا ... گڑھی میں چاچا کی حالت اچھی نہیں تھی - وہ وہموں میں پھنس گیا تھا - اسے بد شکل ہیولے دکھائی دیتے تھے اور خوفناک آوازیں سنائی دیتی تھیں - وہ اپنا علاج ڈاکٹر سے نہیں ، ایک نیم حکیم سادھو سے کروا رہا تھا - اداسی سمپروائے کا وہ سادھو لالچی نہیں تھا - چاچا کا علاج پوری لگن سے کرتا تھا - لیکن چاچا بہتّر برس سے اوپر کا ہو گیا تھا - جینا اُسے بوجھ لگنے لگا تھا - اس کے لیے سب سے بڑی فکر یا سہارا میں اکیلا تھا ... وہ پوس کا مہینہ پورا نہیں کاٹ سکا تھا - رات کو چارپائی پر لیٹا ہوا ہی ختم ہو گیا تھا - مجھے اس بات سے حیرانی ہوئی تھی کہ وہ دونوں جو پگڑی بدل

بھائی تھے۔ انھوں نے اتنے پاپ کیے تھے۔ پھر بھی آخری سانس بڑے آرام سے چھوڑ کر گئے تھے۔ اور دھرم کرم میں لگی رہنے والی ماں انتہا کی جسمانی تکلیفیں اور ذہنی عذاب میں مبتلا ہو کر مری تھی۔ ذہنی عذاب میں تو تینوں رہے تھے۔

چاچا کی آخری رسوم ادا کرنے کے لیے میں ہی تھا۔ میں تو تنہا سا ہو کر بیٹھا تھا۔ تاری اور اس کے باپو نے سارے سنسکار پورے کیے تھے۔ اس کے براہمن ہونے کے ناتے تمام رسوم براہمنوں کو بلا کر ادا کی گئی تھیں۔ رسم کریا والے دن بہت بڑا لنگر لگایا گیا تھا۔ سارے گاؤں میں مٹھائی بانٹی گئی تھی۔ میرے پگڑی باندھی گئی تھی۔

میں تو صرف گنگا میں پھول ڈالنے گیا تھا۔ بس گیا اور آیا ہی تھا۔ دل میں نہ کوئی دکھ تھا اور نہ ہی کوئی کشمکش۔ کتنے چھوٹے عرصہ میں کتنی لمبی زندگی جی لی تھی میں نے۔

فارغ ہو کر میں اور تاری نے گاؤں کی پنچایت سے مل کر بٹوارہ بلایا تھا۔ گرڈھی اور اس کے ساتھ لگتی زمین پر ہسپتال بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ چاچا والی چار ایکڑ اراضی چھوڑ کر ساری فروخت کر دی گئی تھی۔ اس رقم سے ہسپتال کی عمارت کھڑی کی تھی۔ گرڈھی کی ہر دیوار گرا دی گئی تھی۔ پرانی اینٹیں بنیادوں میں لگوا دی گئی تھیں۔ گرڈھی پہلے کھنڈر اور پھر مٹی کا اونچا ٹیلہ بن گئی تھی۔ مندر ایک طرف کھڑا رہا تھا۔ یہ سب کچھ ہوتا ہوا دیکھتے ہوئے مجھے بھی لطف آیا تھا۔ ایک عمارت ڈھے رہی تھی اور ایک دوسری تعمیر ہو رہی تھی۔ ایک ایک دیوار۔ ایک ایک ستون ممٹیاں اور سیڑھیاں ... اینٹ اینٹ کرکے تعمیر ہو رہی دکھائی دیتی تو لگتا جیسے باغ لگایا جا رہا ہو۔ اِن درختوں کو پتے۔ پھول اور پھل آئیں گے۔ وہ لوگ بھی پھل کھائیں گے جو بیماری کا نام جانے بغیر دم توڑ جاتے ہیں۔ جو شہر جا کر دوا لینے کی توفیق نہیں رکھتے۔

تین چار ماہ میں ایک حصّہ بن گیا تھا۔ اس کی پیشانی پر موٹے الفاظ میں لکھی پتھر کی تختی لگ گئی تھی۔ بی بی اندر کور میموریل ہسپتال۔

ہسپتال کے اُدگھاٹن میں تھوڑے ہی دن باقی تھے۔ گاؤں میں فضول باتیں ہونے لگی تھیں... تاری نے لوٹ مچا رکھی ہے۔ 'ننگے پیروں' والے سیمنٹ چوری کر کے کھا گئے...

رام جی نے اپنے ہاتھوں کمایا ہوتا تو درد ہوتا... اُسے اپنے خاندان کی عزت کا خیال ہوتا

تو اس ساری زمین نہ بیچتا۔ اس کا اپنا خاندان ہوتا، تب نا... دانی دان کرے بھنڈاری کا پیٹ پھٹے ...،... مجھے اوتار سنگھ نے سمجھایا تھا "خواہ کتنا ہی نیک کام کرو، تہمتیں تو لگتی ہی ہیں۔"

ایک شام میں سیر سے لوٹ رہا تھا۔ ہلکی ہلکی سردی کے سبب میرے گھٹنے میں درد اٹھنے لگا تھا۔ سورج ڈوب رہا تھا۔ میرے دائیں مٹی کا ٹیلہ بنی ہوئی گڑھی تھی۔ بائیں ہاتھ ہسپتال تھا۔ سامنے گوردوارہ کا نشان صاحب اور گنبد دکھائی دے رہے تھے۔ گڑھی کے ٹیلے پر چھوٹی چاردیواری سے گھرا پرا چین مندر کھڑا تھا۔ جس کی دیواریں موسموں کی مار کھا کر کالی پڑ گئی تھیں۔ مگر کلس چمکدار اور نیا جھنڈا لہرا رہا تھا۔

میرے دل میں کئی روز سے جو اداسی ہلکے ہلکے بخار کی طرح پھیلی تھی وہ تیزی سے گھومنے اور اندر کو جلانے لگی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ ہسپتال بنانے کے جس کام کو میں زندگی کی بہت بڑی حصولیابی سمجھتا تھا وہ تو کچھ بھی نہیں۔ بالکل بے حقیقت ہی ہے.... وہ کیا حصولیابی ہے جس پر فخر کیا جا سکے.... مجھے لگا تھا کہ میرے دل میں جو گہرا سا گڑھا کھدا ہوا تھا وہ تو ویسے کا ویسا ہی ہے۔ منہ کھولے ہوئے۔

صبح کو تاری بھی مجھے روک نہیں سکا تھا۔ وہ خود آیا تھا مجھے ٹرین میں سوار کرانے کے لیے۔ ٹکٹ میں نے تاری سے خفیہ رکھ کر ایک بڑے شہر کا لیا تھا... ٹرین چلنے لگی تھی تو تاری نے پوچھا تھا "اب پھر یسوع نگر میں جاؤ گے نا؟"

"پتہ نہیں... دیکھو... اب کون سا نگر بلاتا ہے۔" مسکراتے ہوئے کہہ کر میں اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا... سوچتے ہوئے ایک پل محسوس ہوا تھا کہ جائیداد کے جس بوجھ نے میرے کندھے جھکا دیئے تھے۔ اس سے سبکدوش ہو گیا ہوں۔ اب پیچھے کی طرف دیکھنا ختم ہوا۔

گاڑی کسی بڑے اسٹیشن پر رکنے والی ہے۔ دن چڑھ رہا ہے... میں نے جو کچھ لکھا ہے۔ اس کے بارے میں سوچتے ہوئے محسوس ہوا ہے کہ یہ بھی تو تاریخ ہی ہے۔ جسے لکھنے پڑھنے اور پھر پڑھانے سے نفرت کرتا رہا ہوں۔

یہ وہ جبیر نہیں

قصبہ سے شہر کی آخری بس میں بیٹھ کر ہری دیو نے مڑ کر تمام سواریوں کی طرف دیکھا۔ ان میں کوئی ایسا سکھ نہیں تھا جس کی داڑھی کالی ہو اور پگڑی نیلی یا کیسری ہو۔ جس سے اس بات کا خوف ہو کہ وہ راستہ میں ڈرائیور کی گردن پر پستول رکھ کر بس کو کسی گاؤں کی طرف لے جائے گا اور اپنے انتہا پسند ساتھیوں کے ساتھ مل کر ہندو مسافروں کو گھسیٹ کر باہر نکال کر گولیوں سے ہلاک کر دے گا۔

کچھ دنوں سے ایسی کوئی واردات نہیں ہوئی تھی مگر گولیوں کا خوف برقرار تھا۔ پتہ نہیں کس وقت کیا ہو جائے۔ بس میں ہی بم پھٹ جائے اور بس مردہ خانہ بن جائے۔ روز گزرتی ایسی وارداتوں کی یاد سے ہری دیو اندر تک لرز گیا تھا۔

بس روانہ ہوئی تو اُس نے ایک بار پھر پچھلی سواریوں پر نظر ڈالی۔ تمام سکھ بڑی عمر کے تھے۔ کافی پیچھے بیٹھے ایک سکھ کی داڑھی کالی تھی۔ مگر اس کی پگڑی بے پروائی سے لپٹی ہوئی اور کرتا پائجامہ دیہاتیوں کا سا تھا۔ وہ شکل وصورت سے شریف لگتا تھا۔

ہری دیو باہر دیکھنے لگا۔ پھر اس نے اپنی توجہ اپنے دوست کے بیٹے کی شادی کی باتوں کی طرف موڑ لی۔ جہاں سے وہ آ رہا تھا... ہم کتنا پیسہ فضول قسم کی رسموں پر خرچ کر دیتے ہیں... خرچ وہی کرتا ہے، جس کے پاس ہوتا ہے۔ جس کے دل میں خوشی اور خواہش ہوتی ہے۔ ... کسی کے دل میں خواہش نہیں بھی ہوتی؟ ہاں... خواہش مر بھی جاتی ہیں۔ آدمی کو بھگائے ہوئے تو یہ خواہشیں ہی پھرتی ہیں... وہ خطرے کے باوجود بسوں میں گھومتا ہے۔ کوئی پستول اُٹھائے پھرتا ہے۔ ڈرائیور کی گردن پر رکھ دیتا ہے۔ بس ایک طرف کو

مُڑ جاتی ہے۔ سواریوں کی چھانٹی کر لی جاتی ہے۔ اخباروں میں ہلاک شدگان اور زخمیوں کی تصویروں کے ساتھ خبریں شائع ہوتی ہیں... پھر باتیں ہوتی ہیں... وہ شادی میں شریک ہونے گیا تھا۔ کیا خبر تھی کہ اس کا مُردہ ہی واپس آئے گا... موت تو کہیں بھی آسکتی ہے۔ گھر میں بیٹھے بٹھائے کو بھی... کوئی دروازے پر دستک دے گا۔ نام پکار کر بلائے گا۔ اُسے کوئی چیز، خیر و عافیت کا کوئی پیغام یا کوئی تحفہ دینے کے بجائے ٹھائیں ٹھائیں کر کے گولیاں چلا جائے گا...

ہری دیو کا ہاتھ کھڑکی کے شیشے سے جا ٹکرایا۔ چھنگلی کی اوپر والی گانٹھ میں سخت درد محسوس ہوا... اس نے مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ وہ کالی داڑھی والا شخص اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ہری دیو نے اپنی نظر سڑک پر بس کے آگے آگے دوڑائی۔ ٹریفک کم تھا۔ بس تیز رفتار تھی۔ ڈرائیور ہندو تھا نا۔ اُسے بھی اندھیرا ہونے سے پہلے اپنے گھر پہنچ جانے کی جلدی تھی... ہو سکتا ہے یہ جٹ سکھ ہی ہو۔ اس کے کیش کٹوا کر خشخشی داڑھی رکھی ہو۔ ... ہری دیو سے ایک بار پھر پیچھے دیکھا گیا۔ وہ شخص ویسے ہی اس کی طرف دیکھ رہا تھا... بس میں ہندو اور بھی ہیں۔ دس، گیارہ، بارہ۔ ہو سکتا ہے کہ میرا بھرم ہی ہو۔ ہر ایک سواری نے آگے کو ہی دیکھنا ہوتا ہے.... اس نے فیصلہ کیا، مُڑ کر پیچھے نہ دیکھے گا۔

بس شہر کے اڈّہ پر رُکی تو ہری دیو نے بس سے اُتر کر پلیٹ فارم کے پیچھے سے جانا چاہا۔ مگر کونے میں کھڑا وہی شخص اسے دیکھ رہا تھا۔ ہری دیو اسے جُل دینے کے لیے کاروں والے گیٹ کی طرف چلا گیا۔ سامنے اس کے واقف کار ایکسائز انسپکٹر کی کار کھڑی تھی۔ اس نے ڈرائیور سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ کسی آفیسر کو لینے آیا تھا۔ جو آیا نہیں تھا۔ جب ہری کار میں بیٹھ گیا تو ڈرائیور نے بتایا کہ وہ پہلے آفیسر کے گھر جائے۔ متعلقہ آفیسر کے نہ آنے کے بارے میں بتائے گا۔ پھر ان کے لیے سبزی خریدنے کے لیے جائے گا۔ پھر اُسے چھوڑ سکے گا.... ہری دیو اس لمبے چکّر کے لیے بھی تیار ہو گیا۔

آدھے گھنٹے کے بعد کار نے اُسے چوک پر اُتار دیا۔ وہ اپنی گلی کے موڑ پر پہنچا تو وہی شخص اس کے سامنے کھڑا تھا۔ ہری دیو اب زیادہ گھبرایا نہیں۔ وہ شخص خالی ہاتھ تھا اور گلی

اپنی تھی.... اسٹین گنیں تو آستینوں میں سے بھی نکل آتی ہیں... سوچتے ہوئے اس شخص کے نزدیک سے گزرنے لگا تو ڈر گیا۔ وہ شخص پیچھے سے بولا "ہری، مجھے پہچانا نہیں؟"

پہچان اس کی آواز سے ہوئی۔ وہ اس کا دوست جبیر سنگھ تھا۔ اس نے دیہاتیوں جیسے کپڑے پہن کر اور اپنی کھچڑی داڑھی کو سیاہ کر کے خود کو رُوپوش کیا ہوا تھا۔ وہ برس ڈیڑھ برس پہلے ہنستا کھیلتا کنبہ چھوڑ کر انتہا پسندوں کے ساتھ چلا گیا تھا۔ پہلے خبر ملی تھی کہ... وہ پولیس مقابلے میں مارا گیا ہے۔ پھر پتہ چلا کہ زندہ ہے۔ سرکار نے اس کے سر کے لیے دس ہزار روپے کا انعام رکھ دیا تھا۔ وہ ایک دن امرتسر میں ایک مشترکہ دوست سے ملا بھی تھا۔ ہری دیو بھی چاہتا تھا کہ وہ کبھی مل جائے۔ ایک بار وہ اس کے گاؤں بھی گیا تھا، اس کے بیوی بچوں کی خیر و عافیت جاننے کے لیے۔ اس کا کنبہ پولیس کی ہر روز کی پوچھ پڑتال سے گھبرا کر گاؤں چلا گیا تھا۔ اس کی گھر والی گزرے واقعات پر بہت روئی تھی۔ ہری دیو نے اسے کچھ روپے دینا چاہے تو اس نے انکار کرتے ہوئے کہا تھا "روپے کیا چاٹنے ہیں، بیر جی"... اپنے مائیکے کے نزدیک کا ہونے کے سبب وہ ہری دیو کو 'بیر جی' (بھائی) ہی کہتی تھی۔

ہری دیو نے جبیر کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ مگر بغلگیر ہوتے ہوئے رک گیا۔ پہلے وہ ہاتھ نہیں ملاتے تھے، صرف بغلگیر ہوتے تھے... "آ گھر چلیں..." وہ اتنا ہی کہہ سکا۔

دروازے پر دستک دینے سے پہلے جبیر نے کہا "گھر میں یہ نہ بتانا کہ میں جبیر ہوں۔ ہم چوبارہ میں جا کر بیٹھیں گے۔"

اتفاق سے سانکل کھلی تھی۔ جبیر سیڑھیاں چڑھ گیا اور پیچھے پیچھے ہری۔ جبیر نہ اپنی بھابھی سے ملا اور نہ بھتیجوں کو۔ اس نے دُم ہلاتے ہوئے ڈبّو کو بھی نظر انداز کر دیا۔ مگر وہ بھی ساتھ ساتھ اوپر چلا گیا۔

ہری پانی لینے کے لیے نیچے اُترا تو اس کی بیوی نے پوچھا "کون ہے؟"... "میرا... کلاس فیلو، ہے ایک... کھنہ سے آیا ہے۔ تو نہیں جانتی۔"

وہ پانی لے کر گیا تو جبیر پگڑی اور جوتے اُتار کر چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے

سر کے بال آدھے سے زیادہ سفید ہو چکے تھے۔ چائے کے بارے میں پوچھنے پر جبیر نے کہا "کچھ کھانے کو بھی لانا، بھوک لگی ہوئی ہے۔"

چائے پیتے ہوئے ہری کو محسوس ہوا کہ جبیر کافی بوڑھا اور کمزور ہو گیا ہے۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی ہیں، آنکھوں کے نیچے گوشت کی پوٹلیاں سی بننے لگی ہیں ... کہاں رہا؟ کیا کرتا رہا؟... کیسے سوچ اچانک بدل گئی؟ ... اپنے ترقی پسند خیالات کو کیسے بھول گیا؟ ... ہری دیو کے دل میں سوالات پیدا ہو رہے تھے۔ مگر پوچھے نہیں جا رہے تھے۔ اندر پیدا ہو رہے سوالات کے الفاظ ترتیب پا کر فقرہ بننے لگتے۔ مگر باہر نکلنے سے جھجک جاتے، بکھر جاتے ... بلآخر ایک سوال نکلا ... "تیری صحت تو ٹھیک ہے؟"

"نہیں۔ مجھے دس روز تک ملیریا رہا۔ اب بخار نہیں۔ مگر کمزوری نہیں گئی ... ایک سالا یہ زخم بھی بھرنے میں نہیں آتا" کہہ کر جبیر نے اپنی دائیں ٹانگ سے پائجامہ اوپر اُٹھایا۔ زخم پر میلی سی پٹی بندھی ہوئی تھی۔

"یہ گندی پٹی اُتار دے۔" کہہ کر ہری دیو نے اس کی طرف دیکھا۔ جبیر نے پٹی اُتاری تو ہری نے دیکھا زخم کافی لمبا اور گہرا تھا۔ جبیر نے زخم کے ارد گرد کے حصّے کی سختی نرمی انگلیوں سے چھو کر اور دبا کر محسوس کی۔ بولا "پتہ نہیں۔ گینگرین ہی ہو گئی سالی۔"

ڈاکٹر لونبہ کو بلا کر دکھا لیں؟" ہری نے پوچھا تو جبیر نے اسے غور سے دیکھا۔ اور سر ہلا کر 'نہ' کر دی ... اُسے شک گزرا کہ کہیں ڈاکٹر لونبہ کی جگہ پولیس نہ آ جائے۔

"ہم خود ہی پٹی کر لیتے ہیں" کہہ کر ہری دوا لینے نیچے چلا گیا۔

جبیر کو اکیلا دیکھ کر ڈبو نے ایک دو بار اس کے پیروں پر پنجے مارے۔ پھر پچھلی ٹانگوں کو جھکا کر گردن آگے کو بڑھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا کئی بار بھونکا۔ جب کوئی جواب نہ ملا تو ایک طرف بیٹھ کر دُم ہلاتا ہوا اس کی طرف دیکھتا رہا۔

سیڑھیاں اُترتے ہوئے ہری کو ڈر سا لگا کہ کہیں پولیس ہی نہ آ جائے، جبیر کو کھوجتی ہوئی۔ ... پھر میں بھی پکڑا جاؤں گا۔ نوکری چلی جائے گی۔ کنبہ بھوکوں مرے گا ... جبیر بھی کہا کرتا تھا۔ موت سے بھوک بری۔

دل کو مضبوط کرتا ہوا وہ دوائیاں لے کر اوپر چلا گیا۔ اس نے ڈاکٹروں کی طرح پہلے اسپرٹ سے زخم کو صاف کیا۔ اس کے اندر مرہم بھرا۔ اوپر پاؤڈر چھڑکا اور پھر نئے صاف کپڑے کی پٹی باندھ دی۔ اسپرٹ لگی روئی سے اپنے ہاتھ صاف کرتے ہوئے پوچھا: "یہ زخم کیسے آ گیا؟"

"دیوار پھاندتے ہوئے مٹی اُلٹنے والے لوہے کے ہل کی انی لگ گئی تھی۔" سن کر ہری سوچنے لگا کہ اس بات میں کتنی سچائی ہو سکتی ہے؟

"کہیں ایکشن پر گیا تھا؟" ہری کے پوچھنے پر جبیر نے اس کی طرف دیکھا۔ پھر آنکھیں جھکا کر افسردہ سا ہو گیا۔ بولا کچھ بھی نہیں... یہ لفظ 'ایکشن' وہ کبھی بحث کرتے ہوئے نکسلیوں کی طرف سے اپنے طے شدہ جماعتی دشمنوں کو ختم کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ہری سے سکھ انتہاپسندوں کی طرف سے کسی شخص کو قتل کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا۔ لفظ 'سودھنا' استعمال نہ ہو سکا۔ جبیر کے پاس ایک اور لفظ بھی تھا 'گڈی چڑھانا'... مگر اب وہ دو برس کے بعد ملے تھے۔ جس حالت میں ملے تھے اس میں وہ 'الفاظ' گندے ہو گئے تھے۔ جیسے دھرم استھانوں میں گالیاں۔

"میں کسی ایکشن اکشن پر نہیں گیا تھا۔" جبیر نظریں جھکائے بتانے لگا "میں تو رات کو کسی کے گھر تھا۔ پولیس نے چھاپہ مارا تو بھاگنے لگا تھا۔ پھر..."

"چل رہنے دے۔" ہری نے اسے روک دیا۔ اسے ڈر تھا کہ بیتے دنوں کے بارے میں جو بھی بات ہو گی، دکھ ہی پیدا کرے گی۔ جس کے بارے میں سوچنے سے بھی وہ ڈرتا تھا۔

"بال بچوں کا کیا حال ہے؟... مل کر...؟" تناؤ سے آزاد ہونے کے لیے ہری نے پوچھا۔

"ٹھیک ہے... ملا تھا... ننہال والے گاؤں میں... تیرا پھوپھا گردھاری بھی ملا تھا۔ مگر اس نے بات نہیں کی۔ ایک طرف کو کھسک گیا۔"

"بڑی گڈی کا رشتہ کر دیا پکا؟"

"ٹوٹ گیا... مکر گئے دولہے والے سالے... یونہی سات ہزار روپے خرچ کرا دیئے۔"

ہری کو خیال آیا کہ انتہاپسندوں نے اتنے بنک لوٹے ہیں۔ یہ سات ہزار کی بات کیوں

کرتا ہے ؟... بھوجائی نے میرے دو ہزار روپے لوٹاتے ہوئے کہا تھا "روپوں کی تو کوئی ضرورت نہیں ... ضرورت تو..." بولتی ہوئی وہ رو پڑی تھی۔ اُسے دیکھ کر چھوٹی گڈی رو پڑی تھی۔ ہری نے اُسے گود میں لے کر چپ کرایا تھا۔ وہ اور کیا کر سکتا تھا؟... وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا... یہ مصیبت کہاں ختم ہو گی؟

دونوں خاموش رہے۔ جبیر کے دل میں کئی باتیں بتانے یا پوچھنے والی اُٹھیں۔ مگر وہ دباتا رہا۔ اُسے ڈر تھا کہ وہ بات کہیں ہری کو ناگوار نہ گزرے۔ اس کے دل میں آئی کہ وہ ہری کو بتائے کہ بلیو اسٹار آپریشن کے بعد اس کی ذہنی کیفیت پہلے زخم کھائے زہر گھولتی ہوئی ناگن ایسی تھی۔ پھر وہ ناگن پھنکارنے لگی۔ پھر اس کا زہر بھرا پوٹا کسی کے جسم میں پلٹ جانے کو تڑپتا رہا... مگر وہ خاموش ہی رہا۔ ہری کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔

ہری کے دل میں آیا پوچھے۔ جبیر تُو نے کوئی بندہ قتل کیا؟... پھر اسے لگا کہ یہ تو اس طرح کی بات ہو گی کہ کوئی برہمچاری سے جماع کے بارے میں پوچھے۔ خواہ اس نے بُرا کام کیوں نہ کیا ہو... پھر وہ جبیر کے تشدد پسند ہونے کے بارے میں سوچتا رہا۔

ہری کو یاد آیا... ایک روز وہ دونوں ایک کامریڈ دوست کے جاگیردار باپ کے گھر گئے تھے۔ اس کے ڈرائنگ روم میں دیواروں پر ہرنوں کے کٹے ہوئے سر ٹنگے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھیں دیکھنے والے کو لگاتار دیکھ رہی تھیں۔ جن کو دیکھ کر جبیر کو تکلیف ہوئی تھی۔ اس نے بوڑھے سردار کے سامنے ہی کہہ دیا تھا: یہ کمرہ تو بوچڑ خانہ لگتا ہے۔ اس معصوم جانور کا سر کاٹ لینے میں کون سی بہادری ہے؟ کوئی شیر مارا ہوتا۔ جبیر ان ہرنوں کی نظروں کو برداشت نہیں کر سکا تھا۔ وہ جلدی اُٹھ کر چلنے کو تیار ہو گیا تھا... وہ کون سا جبیر تھا؟... پھر کیا وہ بھی جبیر ہی تھا جو ہری کے ساتھ سیر کو جاتا ہوا املتاس کے ایک درخت کی جڑ میں آگ جلتی دیکھ کر دُکھی ہو جاتا تھا۔ جمعدارنیاں سوکھے پتّے اکٹھے کر کے اس درخت کے نیچے رکھ کر آگ جلا کر تاپتی تھیں... جبیر اُن بجلی کرمچاریوں پر بھی ناراض ہو جایا کرتا تھا جو بجلی کی تاریں سیدھی کرتے وقت درختوں کے سر کاٹ ڈالتے تھے... اور پھر وہ بھی جبیر ہی تھا جو مزدوروں کسانوں کی ڈکٹیٹر شپ کے خواب دیکھتا ہوا خالصہ راج کا

خواب دیکھنے لگا تھا۔ اُس کی زبان دو پھاڑ ہو کر ہری کے پاس کچھ اور دوسروں کے پاس اور بولنے لگی تھی جس کو انقلاب بندوق کی نلی میں سے نکلتا تو دکھائی دیتا تھا۔ مگر وہ اسے ماؤ کی لال کتاب کی بجائے گوروؤں کی بانی میں دیکھنے لگا تھا۔

"بھو..." ہری کے منہ سے گالی نکلتی ہوئی لوٹ گئی۔ جو وہ اکثر جسبیر کو دے لیا کرتا تھا۔ اب اس نے گالی پتہ نہیں کس کو نکالی تھی؟ جسبیر کو؟ خود کو یا اُن حالات کو جن میں وہ ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تھے... اس نے ایک بار پھر جسبیر کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اُسے لگا کہ ... یہ وہ جسبیر نہیں۔ یہ تو اس کا بھوت ہے جس کے وجود سے ہی سارے ماحول میں دہشت پھیل جاتی ہے۔ چلتے ہوئے رگوں میں خون جمنے لگتا ہے۔ اس لیے ایک بار پھر جسبیر انتہا پسند کی طرف دیکھا۔ مگر اس کے چہرے پر تو ایسا کچھ نہیں تھا۔ اُس کی آنکھوں میں تو نمی تھی اور سانس تیز چل رہی تھی...

جسبیر کے دل میں ایک بات زور سے اُٹھ رہی تھی، باہر نکلنے کے لیے... ایک شام جب وہ چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن سے گاؤں کی طرف جا رہا تھا تو سڑک پر چلتے ہوئے اُسے ہری یاد آیا۔ اس نے محسوس کیا کہ جیسے وہ اس کے ساتھ چل رہا ہے۔ جب اس نے اس کے نہ ہونے کو محسوس کیا تو اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ رویا کیوں تھا؟... اور اب اُسے مل کر وہ جذبہ کیوں نہیں اُمڑا؟ لیکن اس نے ہری کو یہ بات بتائی نہیں۔ صرف اتنا پوچھا "ہری تم کتنے ڈرے ہوئے ہو؟"

"جتنے دوسرے ہندو... یا باہر گھومتے کیسوں (بالوں) کے بغیر سکھ لڑکے"... ہری کا دل کیا کہ وہ بتائے کہ جب کبھی اسے فیکٹری سے لوٹتے ہوئے اندھیرا زیادہ ہو جاتا ہے تو وہ اپنے پیچھے آ رہے موٹر سائیکل، اسکوٹر یا موپیڈ سوار سکھ نوجوان کو دیکھ کر دل دہل جاتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے اس نے اپنی داڑھی بڑھا لی تھی۔ رات کو گھر آتا تو سر پر کیسری پگڑی لپیٹ لیتا تھا... ایک رات اسٹریٹ لائٹ جل نہیں رہی تھی۔ جب وہ اپنے دروازے پر آیا تو کنبے کے سب لوگ خوفزدہ ہو گئے تھے۔ وہ دروازے پر دستک ہونے پر پہلے درازوں میں سے دیکھتے ہیں۔ اس روز پگڑی کو دیکھ کر وہ گھبرا گئے تھے...

ہری نے وہ بات نہیں بتائی، صرف اتنا بتایا کہ وہ رات کو پگڑی باندھ کر نکلتا ہے۔ اور اسے دیکھ کر راہ چلتے کئی لوگ ڈر جاتے ہیں... بتا کر ہری ہنسنے لگا۔ مگر جسبیر کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ کچھ سوچتے ہوئے اس نے پوچھا "ہری تو کسی دھرم کو تو مانتا نہیں، پھر کیوں نہیں کیش رکھ کر سِکھ ہو جاتا؟ میرا مطلب ہے سکھوں جیسی شکل بنا لیتا؟"

ہری یہ بات سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ جسبیر نے یہ بات اپنے دوست کی جان بچانے کے لیے کہی ہے یا اپنے عقیدہ کے مطابق سارے پنجاب کو خالصتان بنانے کے لیے؟... یا اُسے یقین ہے کہ یہاں ہندو نہ رہ سکیں گے۔ اگر رہیں گے تو دوسرے درجہ کے شہری بن کر۔ جیسے عیسائیوں میں یہودی رہتے ہیں۔ جب کسی یہودی کے منہ پر کوئی عیسائی تھوک دیتا تھا تو وہ رومال سے منہ پونچھ کر آگے نکل جاتا تھا... یا جسبیر نہیں چاہتا تھا کہ ہری یہودی بن کر رہے۔

ہری جب اپنی سوچوں میں بہت اُلجھ گیا تو اس کے نکلنے کے لیے پوچھا "تُو تنگ تو بہت رہا ہوگا۔ روپوش ہو کر؟"

"ہاں، رہا۔"

"موت کے بھی روبرو ہوا کبھی؟"

"ہوا... لیکن زیادہ نہیں... موت تو کبھی بھی، کہیں بھی، کیسے بھی آ سکتی ہے۔ میرے تو ساتھ ساتھ پھرتی رہی ہے... پھر ڈر نکل گیا... لیکن اب ہے، تیرے پاس، تیرے گھر میں بیٹھ کر... جب بندہ گھر کے اندر بیٹھ جاتا ہے تو موت سے ڈرنے لگتا ہے۔"

"کسی خاص موقع پر موت دور بھی ہو جایا کرتی تھی؟" پوچھ کر ہری جسبیر کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

جسبیر بولا نہیں... اس کے دل میں وہ عظیم لمحات آئے جب کوئی شخص اپنے دشمن کو قتل کرنے یا خود شہید ہونے کی خواہش لیے مجذوب کی طرح پھرتا ہے۔ اس کا دل کرتا ہے کہ کسی کے پیٹ میں بلّم گھونپ کر اس کی آنتیں نکال کر باہر بکھیر دے یا گولیاں مار مار کر کسی کو چھلنی کر دے... تب لگتا ہے کہ تمام قلعوں پر ہمارے جھنڈے لہرانے والے ہیں۔ یا جن کو

قتل کیا گیا ہے وہی اس کی راہ کے روڑے تھے ۔ ... جب نکسلی تحریک چلی تھی تو وہ اس کے ہمدردوں میں تھا، گرفتار کر لیا گیا تھا۔ لیکن دشمنوں کی آنتیں نکالنے اور چھلنی کرنے کا ارمان دل میں ہی رہ گیا تھا۔

اپنے دل کی بات چھپانے کے لیے جبیر نے اپنا گھٹنا کھڑا کر لیا اور ہاتھ زخم پر بندھی پٹی پر رکھ لیا۔

ہری کے دل میں آیا کہ پوچھے ۔ کسی معصوم راہ گیر کو قتل کر کے اور ہٹ لسٹ والے شخص کو قتل کرنے میں فرق ہوتا ہے؟ ... لیکن الفاظ فقرہ بنتے ہوئے اس کے اندر ہی اُلجھتے رہے۔ کچھ کہنے کے لیے اس نے پوچھا "اب بھی درد ہوتا ہے؟"

"نہیں ... میٹھی کھجلی ہوتی ہے"۔ کہہ کر جبیر نے زخم پر سے ہاتھ ہٹا لیا۔ اور دیوار کے سہارے بیٹھ گیا۔

ہری نے سگریٹ کی ڈبیا نکالی۔ مگر کچھ سوچ کر پھر سے جیب میں ڈال لی۔ جبیر مسکرا دیا۔ بولا "پی لے، مجھے معلوم ہے۔ اس کے بغیر تجھے بات نہیں سوجھے گی"۔

ہری کو یاد آیا۔ جب وہ جبیر کے گھر جایا کرتا تھا تو جبیر بذات خود ایش ٹرے اُٹھا کر اس کے آگے رکھتا تھا... لیکن اب اس کے سامنے بیٹھا جبیر کوئی اور تھا۔ جس نے پتہ نہیں کتنے معصوم بچے قتل کیے ہوں ... ہری نے اپنی کرسی پیچھے کی طرف کھینچ لی۔ اور سگریٹ سلگا لیا۔ پھر بڑی احسان مندی کی نظروں سے اس کی طرف دیکھا جبیر کو لگا کہ اس شکل والے اور یہ کام کرنے والے شخص سے اسے جو نفرت پہلے تھی وہ اب بھی ہے۔ لیکن ہری کے ساتھ ایسا نہیں۔ اس کا دل ایک دم ہری کے لیے محبت سے بھر گیا۔ اس کا دل کیا کہ وہ بھابی کو بلائے۔ دونوں بچوں کو پاس بٹھائے۔ ان کو گود میں لے کر پیار کرے۔ بھابی سے پوچھے کہ اس کے پیٹ میں جو درد رہتا تھا اس کا کیا حال ہے۔ یہ سوچتے ہوئے اس کی آنکھوں میں نمی آنے لگی جو اس نے اِدھر اُدھر نظر گھما کر سکھا لی۔

ہری نے اپنی بیوی کو جبیر کے بارے میں سب کچھ بتایا ہوا تھا۔ لیکن بچوں کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ ایک بار چھوٹے بیٹے نے پوچھا تھا کہ جبیر انکل اب ہمارے گھر کیوں نہیں آتے؟ تو

اس نے اتنا ہی بتایا تھا کہ اب وہ بیمار ہے۔ اپنے گاؤں میں ہے۔ جب اس نے اس گاؤں میں جانے کی ضد کی تھی تو ہری کو بہانہ بنانا مشکل ہو گیا تھا۔

جبیر کو اس لڑکے سے بہت پیار تھا۔ وہ اسے پیار سے 'میرا بندر' کہا کرتا تھا۔ جبیر جب بھی آتا تھا، وہ اس کی گود میں جا بیٹھتا تھا۔ کھانا اس کے ساتھ کھاتا تھا۔ جبیر جس چمچے سے خود کھاتا تھا وہی اس کے منہ میں بھی ڈال دیتا تھا... یہ سوچتے ہوئے ہری کا دل بھر آیا۔ اندر سے دباؤ بڑھ گیا تو اس سے پوچھ ہی لیا "بندر کو نہیں ملنا؟"

جبیر نے اپنی آنکھوں پہ بانہہ رکھ لی۔ ہری شرمندہ ہو گیا اپنی غلطی پہ... کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد ہری نے شرمندگی دور کرنے کے لیے خوشی کی بات چھیڑی: "جبیر تجھے یاد ہے۔ مس کرانتی عرف کامریڈ پدما؟ جس کے ساتھ بات کرتے ہوئے تیرا چہرہ سُرخ ہو جاتا تھا۔ وہ ایک بات پہ تجھے خاموش کرا دیتی تھی۔ وہ ایک انگریز کے ساتھ شادی کر کے امریکہ چلی گئی۔ کسی براڈکاسٹنگ سروس میں کام کرتی ہے۔ سامراجیوں کی خدمت کرتی ہے۔"

جبیر نے اپنے پیچھے بڑے تھیلے کو ایک طرف کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا... پگڑی کے سرے سے آنکھیں ملتے ہوئے سوچا۔ یہ کہیں طنز تو نہیں کر رہا؟ پھر بے فکر ہو کر تحمّل سے بولا "کچھ عرصہ پہلے میرا یہ یقین سا بن گیا تھا کہ مجھے اپنا ماضی بھول جانا چاہیے۔ ماضی کی اپنی ساری تاریخ... دنیا کے سب رشتے ناتے... پھر یہ دنیا اپنے آدرش کے مطابق ڈھالی جا سکتی ہے... لیکن پچھلے کچھ دنوں سے میرا یہ یقین ٹوٹ گیا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ بیتے سب کچھ سے ٹوٹا نہیں جا سکتا... میرا اندر جو نفرت اور غصّے سے بھرا پڑا تھا اب اس کے بوجھ تلے دب رہا ہے... چلو چھوڑو... بہتر یہی ہے کہ ہم فی الحال بیت رہے لمحات کے بارے میں کوئی بات ہی نہ کریں۔"

وہ دونوں چپ ہو گئے۔ کافی دیر تک بول نہ سکے۔ خاموشی سے بچنے کے لیے ہری ڈبّو کے کانوں کے اندر چمڑی میں دھنسی جوئیں نکالنے لگا۔ اور جبیر اپنا تھیلا ایک طرف کر کے لیٹ گیا... ہری کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ چھو کر دیکھے کہ جبیر کے تھیلے میں کیا ہے؟... مگر وہ پوچھ تک نہ سکا۔ تبھی جبیر نے اپنی آنکھوں پر پھر بانہہ رکھ لی۔

ہری کو لگا کہ جبیر اپنے بیوی بچّوں کی یاد کی وجہ سے دُکھی ہے۔ وہ کوئی اور بات کرنے

کے لیے الفاظ تلاش کرنے لگا۔ تبھی باہر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ ہری جبیر کو بیٹھے رہنے کا اشارہ کر کے نیچے اُتر گیا۔

دروازہ کھولا تو میر محلّہ چودھری رام سرن کھڑا تھا۔ ہری نے شکر کیا کہ پولیس نہیں تھی۔ چودھری امن کمیٹی کی میٹنگ کے لیے کہنے آیا تھا۔

ہری نے چوبارہ میں جاکر جبیر کو بات بتادی۔ تو بھی اس کا ڈر نہیں گیا۔ اسے شک گزرا کہ اُسے اس گھر میں داخل ہوتے وقت کسی نے دیکھ لیا ہے۔ کہیں چودھری نے تو نہیں...؟... یا چودھری کو... ہری نے...؟

اندھیرا ذرا گہرا ہوا تو وہی خوف ہری کے چہرے پر آگیا۔ اُسے لگا کہ شاید چودھری کو شک ہوگیا ہو یا جبیر نے چوبارہ کی کھڑکی کھول کر باہر دیکھ لیا ہو۔ اور چودھری نے اسے دیکھ لیا ہو... اس کی نظروں میں چودھری ہندو فرقہ پرست تھا۔ جس سے اسے نفرت تھی... سوچتے ہوئے اسے اس خوف نے گھیر لیا کہ کہیں جبیر رات بھر کے لیے اس کے گھر نہ رک جائے۔ پھر رات کیسے بیتے گی؟ چھاپہ کسی بھی وقت پڑ سکتا ہے۔ اس نے چاہا کہ جبیر اب چلا جائے تو اچھا ہو۔ موت اور بھوک کے تصور کے آگے ساری محبت گھُل گئی۔ مگر کہہ کچھ نہ سکا۔ جب بولا تو "یہ اب ہم کھانا کھالیں... کہو تو ڈھابے سے ماں کی دال لے آؤں؟"

"نہیں... تو کہیں بھی جانے کی زحمت نہ کر۔"

کہہ کر جبیر کو لگا کہ اس دل میں یہ بات ہری کے بارے میں پیدا ہوئے شک نے اُگلوادی ہے۔ اس کا لہجہ بھی ایک دم بدلا ہوا تھا... ہری کو اس کے دو الفاظ "نہ کر" کے لہجہ کی کرختگی محسوس ہوئی... یہ دس ہزار روپے کے لیے میرے بے ایمان ہونے کی بات جبیر کے دل میں کیوں آئی؟... دونوں پریشان ہوگئے۔ پھر بات کو ضائع کرنے کے لیے جبیر نے خود ہی کہہ دیا "میرے لیے سرکار نے دس ہزار روپے کا انعام رکھا ہوا ہے۔" اور پھر خود ہی ہنسنے لگا۔

دوستوں کے درمیان اس کمینی سی بات کی چبھن محسوس کرتا ہوا ہری نیچے اُتر گیا۔

وہ دو تھالیوں میں کھانا لایا کھانے لگے تو ہری کو یہ کام کچھ غلط سا لگا۔ انھوں نے کبھی

اس طرح الگ الگ تھالیوں میں کھانا نہیں کھایا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد جب ہری نے کاغذ میں لپیٹ کر لایا ہوا گُڑ آگے کیا تو جبیر نے کہا۔

"تیری یہ گُڑ کھانے کی عادت نہیں گئی"۔ اب جبیر کا لہجہ بہت عام سا تھا۔

"لیکن اب یہ وہ گُڑ نہیں جو تو گاؤں سے لایا کرتا تھا... اور وہ تِلوں کے لڈّو، جو بے (ماں) بھیجا کرتی تھی میرے لیے"۔ وہ دونوں ہنس پڑے۔

ہاتھ دھو کر جبیر نے پگڑی باندھتے ہوئے کہا "اچھا، اب میں چلتا ہوں"۔

دو برس پہلے جبیر اس طرح چلنے کی بات کرتا تو ہری کہتا "چل کر تو دیکھ... ڈبّو پکڑ لے چور کو"، یا کہتا 'پندرہ منٹ اور رُک جا، صرف پندرہ منٹ۔ بس مجھے یہ سگریٹ ختم کر لینے دے'... یا پھر دونوں مل کر گاتے 'چلے جانا او جلدی کرنے والے... دو پل اور بیٹھ جا'۔

... مگر اس نے کچھ نہ کہا۔ بلکہ اس نے سکھ کی سانس لی۔ پھر بھی اس نے دل رکھنے کے لیے ہی کہا "رات کو کہاں جائے گا... یہیں کاٹ لے"۔

"نہیں... میرا یہاں رہنا ٹھیک نہیں..." کہہ کر جبیر نے چوبارہ کی کھڑکی کھول کر باہر نظر دوڑائی۔ گلی کی بتّی پہلے کی طرح بجھی ہوئی تھی۔ اس نے چادر سے چہرہ ڈھانپ لیا اور بُکل ماری۔ سیڑھیوں سے اُترتے ہوئے اس نے ہری سے کہا کہ وہ ایک بار باہر جا کر گلی کا جائزہ لے۔

ہری نیچے اُترا تو اس کی بیوی آنگن میں ڈری ہوئی کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ اس نے ڈرتے ہوئے دھیرے سے پوچھا "سچ سچ بتاؤ۔ یہ کون ہے؟"

"میرا ہم جماعت ہے۔ کھنہ کا... جانے کو تیار ہے"۔

"جھوٹ کیوں بولتے ہو... میں نے خود آپ کے منہ سے جبیر کا نام سنا ہے"۔

"ہاں ہاں، جبیر ہے، مگر یہ وہ نہیں۔ کوئی اور ہے"۔

"پھر یہ رات کو کیوں چلا ہے گھر سے؟ ایسے برے تو دن ہیں... اب تو بس بھی نہیں جاتی کوٹی"۔

بیوی کی رونے جیسی آواز سُن کر ہری سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ جبیر کو جلدی گھر سے نکالنے کے لیے کہہ رہی ہے یا اسے رات بھر کے لیے چھپا کر رکھنے کو... اس اُلجھن میں

سے ایک بات سوجھی۔ اس نے اپنی بیوی کو بتایا "اس کی یہاں رشتے داری ہے۔ وہاں چلا ہے۔" کہہ کر ہری دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

اس کی بیوی دبے پاؤں اُوپر گئی۔ اُس نے چوکھٹ کے ساتھ لگ کر اندر دیکھا جسبیر سنگھ چارپائی پر ٹانگیں لٹکائے ہوئے بیٹھا تھا۔ ڈبّو اس کی ٹانگوں سے چمٹتا دانتوں سے کاٹتا ہوا کھیل رہا تھا۔ جسبیر اس کے دونوں کان پکڑ کر ہلا رہا تھا۔

بھابی کو دیکھ کر جسبیر نے ڈبّو کے کان ایک دم چھوڑ دیئے۔ اور اسے پیچھے ڈھکیل دیا۔ خود کھڑا ہو گیا۔ وہ نہ اپنا چہرہ چھپانے کے قابل تھا اور نہ ہی ست سری اکال، کہنے کے قابل۔ بھابی تیزی سے نیچے اُتر گئی۔ اس کے دل کی چھت گرنے لگی تھی۔

ہری نے ہری جھنڈی دکھائی تو جسبیر تیزی سے نیچے اُترا، چادر سے چہرہ ڈھانپے ہوئے۔ چھوٹے سے آنگن میں سے گزرا۔ دروازے میں رُک کر اُس نے چاروں طرف دیکھا۔ پھر ہری کی طرف دیکھتا ہوا بولا "میں پرسوں سے تجھے یہ بات بتانے کے لیے ڈھونڈ رہا تھا۔ آنے والے سات روز رات کی ڈیوٹی نہ کرنا۔ اور بچّوں کو باہر نہ نکلنے دینا" کہہ کر وہ جلدی سے چلتا ہوا۔ لنگڑاتا ہوا گلی کا موڑ مڑ گیا۔

ہری نے اندر کی سانکل ٹھیک سے بند کر دی۔ اور کمرے میں آکر بیٹھ گیا۔

جب وہ بستر پہ پڑا سوچ رہا تھا تو بیوی نے اس کی طرف منہ کر کے کہا "اگر سچ بتا دیتے تو کیا ہرج تھا؟"

"باؤلی ہو گئی ہے تو؟ وہ جسبیر تو پتہ نہیں کہاں مر کھپ گیا ہو.... اچھا مجھے پریشان مت کر... سونے دے۔" کہہ کر اس نے کروٹ بدل لی۔ اور آنکھیں بند کر کے سونے کا بہانہ کرنے لگا۔

ارجن چھیڑ گڈیر نا*

پیاری کیتھرین۔

مجھے یہاں گاؤں آئے کوئی سولہ روز ہو چکے ہیں۔ چاچاجی کی حالت پہلے جیسی ہی ہے۔ پتہ نہیں مجھے اور کتنے دن یہاں رکنا پڑے۔ چاچاجی کو میں اس حالت میں چھوڑ کر نہیں آسکتا صبح کے نو بجے ہیں۔ گرمی کی شدّت کم ہونے لگی ہے۔ تہواروں کا مہینہ آرہا ہے۔ اگر تو میرے ساتھ آجاتی تو اتنی دِقّت والی بات بھی نہیں تھی۔ تُو پنجاب کے دسہرہ اور دیوالی کا لطف ایک بار پھر اُٹھا لیتی۔ ساتھ ہی دیہات میں بھی گھوم لیتی۔ دراصل انگلینڈ میں بسے بھارتیوں سے مل کر اور ان کے درمیان رہ کر بھی ان کی سوچ کا ٹھیک اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ میرے ساتھ زندگی گزار کر بھی نہیں۔

چاچاجی دوائی کھا کر سو گئے ہیں۔ تبھی مجھے یہ لکھنے کا موقع ملا ہے۔ نہیں تو وہ باتیں کرتے ہیں۔ سوال پوچھتے ہیں۔ حکم دیتے ہیں اور نصیحتیں کرتے ہیں... ہمارے بزرگ بسترِ مرگ سے بہت نصیحتیں کرتے ہیں۔ جیسے ساری عمر کا نچوڑ بتانے کو اتاولے ہوں۔ جس کے بغیر نئی نسل کا جینا دشوار ہو سکتا ہے۔

عام بھارتیوں کی طرح یہ بھی موت سے ڈرتے ہیں۔ آتما کے امر ہونے اور جسم کے فانی ہونے کے گیتا گیان یا کسی مہان اُپدیش کا سہارا تلاش کر رہے ہیں... چارپائی پر لیٹے ہوئے ہیں۔ ان کی ننگی پیٹھ میری طرف ہے۔ ریڑھ کی ہڈّی کے ساتھ جُڑی ہوئی تمام ہڈیاں دکھائی

---

* چھوٹی گاڑی۔ رتھ۔

دے رہی ہیں۔ سانس کے پھنس کر آنے کا پتہ چلتا ہے۔ چاچی دوسرے کمرے میں بیٹھی پاٹھ کر رہی ہے۔ بہن گومتی آئی ہوئی ہے۔ ہم تینوں ان کی خدمت میں لگے رہتے ہیں۔

چاچا جی کبھی کبھی خود کو سمجھانے کے لیے مرزا غالب کا یہ شعر پڑھتے ہیں... غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جُز مرگ علاج... مگر سمجھانے مجھے لگتے ہیں کہ موت ہی آخری علاج ہے۔ زندگی کی اس شمع کو صبح ہونے تک جلنا ہے... ویسے وہ موت کو صبح کہتے ہیں۔ مگر یہ بھی موت کے خوف سے نجات حاصل کرنے کی ان کی کوشش سی لگتی ہے۔

آج صبح جاگے تو اپنی ٹانگوں کا لٹکتا سا مانس پکڑ پکڑ کر مجھے دکھاتے ہوئے کہنے لگے۔

''اس طرح ماتس ہڈیوں کو چھوڑ دیتا ہے... بھورُو کی گردن کا مانس بھی ایسے ہی لٹکنے لگا ہے۔''

بھورُو ان کے کُتّے کا نام ہے۔ ایسے ہی آوارہ سا کتّا ہے۔ گیارہ بارہ برس کا بوڑھا ہے۔ گرمی لگتی ہے تو نیم کے پیڑ کے نیچے جا کر لیٹ جاتا ہے۔ مکھیاں تنگ کرتی ہیں تو بھوسے والی کوٹھری میں جا کر بیٹھ جاتا ہے... وہ بھی بیمار ہے۔ اس نے بھی چاچا جی کی طرح کھانا پینا چھوڑا ہوا ہے... چاچا جی کو وہم ہے کہ ان دونوں کو اکٹھا مرنا ہے۔ اسی لیے وہ تھوڑی دیر کے بعد بھورُو کی خیر خیریت پوچھتے رہتے ہیں۔

ایک دن مجھ سے کہنے لگے ''بھتیجے بس یہی ہوتی ہے اننت نیند... پھر پتہ نہیں کیا ہوتا ہے؟ کون سا جنم لینا ہے؟... پتہ نہیں کہ کوئی اور جنم ہوتا بھی ہے یا نہیں؟ مجھے تو یہ سب باتیں جھوٹی سی لگتی ہیں۔''

میں اب ان کی تسلّی کے لیے اپنے اعتقاد کے برعکس کیسے کہہ دوں کہ جی ہاں۔ دوسرا جنم ہوتا ہے۔ انسان کو انسان کا ہی جامہ ملتا ہے... کئی بار دل کرتا ہے کہ ان سے جھوٹی باتیں بھی کہتا جاؤں۔ جن سے ان کو سُکھ ملتا ہو۔ ویسے بڑی عمر تک یہ ریٹائرڈ اسکول ماسٹر چاچا جی بھی مانتے رہے ہیں کہ دوسرا کوئی جنم نہیں ہوتا۔ اچھے بُرے کرموں کے پھل یہیں بھوگ لیے جاتے ہیں... مگر آج کل یہ اس اُلجھن میں ہیں... گذشتہ شام کہنے لگے ''میں نے تو نہ اچھے کرموں کا پھل بھوگا ہے اور نہ ہی بُرے کرموں کا... اس جنم میں جو بُرے کرم کیے ہیں ان کی سزا تک نہیں ملی۔ کوئی سوچ سکتا ہے کہ اس اسکول ماسٹر نے بھی بہت بُرے کرم کیے ہیں؟''

"آپ نے بھی بڑے کرم کیے ہیں؟" میں نے بڑی حیرانی سے پوچھا تھا۔

"ہاں ... میں نے بھی کیے۔ اپنے پرکھوں نے بھی کیے ... یہ جو ہم دیگر تینوں ورنوں کے لوگوں کو اپنے سے کمتر سمجھتے ہیں۔ یہ کوئی کم نیچ کرم ہے؟ ... تم بچ گئے ہو بھتیجے اس پاپ سے۔" کہہ کر وہ پشچاتاپ کرنے لگے۔ پھر جلدی سے بولے "میرے لیے حقہ بھر دو۔ یوں ہی دو کش لوں گا ... مَن میں گھبراہٹ سی پیدا ہو رہی ہے ... دیکھو بھتیجے انکار نہیں کرنا۔ ڈاکٹر کی بات نہ بتانا ... اگر مرنا ہی ہے تو چاہے پھیپھڑے کام کرنا بند کر دیں، رک جائے چاہے دل۔ کیا فرق پڑتا ہے؟"

ڈاکٹر نے سخت ممانعت کر رکھی ہے حقّہ پینے کی۔ مگر چاچاجی کی تڑپ مجھ سے دیکھی نہ گئی۔ میں نے تھوڑا سا تمباکو ڈال کر چلم بھر دی اور حقّہ لا کر ان کے آگے رکھ دیا تھا ... تم یقین کرنا کیتھرین۔ جو شخص گولی کھانے کے لیے یا دو گھونٹ دودھ پینے کے لیے اٹھتا ہوا میرا سہارا لیتا تھا وہ چارپائی کی پاٹی کا سہارا لے کر جھٹکے سے اُٹھ کر بیٹھ گیا اور کش اس طرح لینے لگا جیسے دودھ چھڑائے بچّے کو اچانک اپنی ماں کا دودھ مل گیا ہو ... مگر اسی وقت انھیں کھانسی اتنے زور سے آئی کہ چارپائی پر اوندھے منہ لیٹ گئے۔ تبھی چاچی اور بہن گومتی آگئیں۔ وہ دکھی نظروں سے مجھے چاچاجی کو سنبھالتے دیکھتی رہیں۔ میں شرمسار سا چاچاجی کے منہ میں دوائی ڈالنے کی کوشش کرتا رہا۔

وہ ذرا سنبھلے تو اُن کا پہلا سوال یہی تھا "بھورو کہاں ہے؟"

"نیم تلے لیٹا ہوا ہے ... اس کے لیے بھی حقّہ تازہ کر دیں؟" چاچی نے تلخی سے پوچھا۔

بیوی کی بات سن کر وہ مسکرائے۔ اور اپنی گھسی ہوئی دھوتی کے پلّے سے اپنا ننگا جسم ڈھانپتے ہوئے کروٹ بدل کر لیٹ گئے ... اور میں خود کو سنبھالتا ہوا شوالے کی طرف چلا گیا تھا۔

چاچاجی جاگ گئے ہیں۔ انھوں نے زور لگا کر کروٹ لی ہے۔ بجھی بجھی سی نظر سے مجھے دیکھتے ہیں۔ پوچھتے ہیں "کیا لکھ رہے ہو؟"

"چٹھی لکھ رہا ہوں، آپ کی میم بہو کو ... کچھ لکھوانا ہے؟"

"بچوّں کو پیار اور دعائیں لکھ دے ... تیری چاچی کیا کر رہی ہے؟ ... اس کے پاس پانچ روپے ہیں، ملکہ کے ... دو تُم لے جانا۔ ایک ایک دے دینا بچوّں کو ... کبھتریں کے لیے آرسی لے جانا، دادی والی ... ایک گلاب پاشی ہے، تیرے باپ کے حصّے کی، میرے پاس ... حصّہ کا ہے کا ... نشانی ہے اپنے خاندان کی ... مکٹ تیری دادی نے گومتی کو دے دیا تھا ... نشانی بھی کیا ... خاندان بنتے ہیں، ٹوٹ جاتے ہیں ... کوئی کہیں چلا جاتا ہے، کوئی کہیں۔ بکھر جاتے ہیں سب ... سارا جگ میلہ بچھڑ جاتا ہے۔"

بولتے بولتے چاچاجی رونے لگ گئے ہیں۔ میں نے ان کو روتے ہوئے آج پہلی بار دیکھا ہے۔ یہ تو گومتی کی ڈولی کے جانے پر بھی نہیں روئے تھے۔

پھر آنسو پونچھ کر کہتے ہیں "اپنی چاچی سے کہہ، بھورو کے آگے دو گھونٹ دودھ ڈال دے۔ شاید کچھ گلے اُتر جائے اس کے۔"

بہن گومتی آکر بتاتی ہے کہ بھورو سے تو بدبو آنے لگی ہے۔ چاچاجی کا چہرہ یک لخت اُتر گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان کو بھی محسوس ہونے لگ گیا ہوگا کہ ان کے جسم سے بھی بو آنے لگی ہے ... میرے قلم کا چلنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔

"میرا چہرہ سوجنے تو نہیں لگ گیا؟" وہ پوچھتے ہیں۔

"نہیں ... مجھے تو پہلے سے اچھا لگتا ہے۔"

"اچھا ...؟" وہ حیرانی سے لمبا سانس کھینچ کر کہتے ہیں۔ پھر گانے کے انداز میں سُر میں بولتے ہیں "ارجن چھیڑ گڈیرنا ... بھلی کریں گے رام" اور پھر اپنے چہرے کی سوجن کو دائیں ہاتھ سے چھو کر محسوس کرتے ہیں۔

'ارجن چھیڑ گڈیرنا' یہ بول میرے علاقے کے ایک بھولے بسرے شاعر کی لکھی مہابھارت کے ہیں۔ جس میں بھگوان کرشن ارجن کو دلاسا دیتے ہوئے کہتے ہیں تو اپنا رتھ میدان جنگ میں لے چل، رام بھلی کریں گے ... مگر اس سے چاچاجی کا اشارہ دوسری دنیا میں جانے کی طرف ہوتا ہے۔

"نیند کیسی آئی؟" میں چاچاجی سے پوچھتا ہوں۔

وہ فارسی کا ایک شعر پڑھتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جب میں جاگ رہا ہوتا ہوں تو

مجھے خیالات پریشان کرتے ہیں۔ جب سوجاتا ہوں تو خواب پریشان کرتے ہیں، کیونکہ میرا محبوب میرے پاس نہیں ہے... چاچاجی بتاتے ہیں کہ انھیں خواب زیادہ پریشان کرتے ہیں۔ایک ہی بار بار دکھائی دیتا ہے۔ نیند آتی ہے تو ایک کنواں دکھائی دیتا ہے۔ اندھا کنواں، میں اس کی مینڈھ پر بیٹھا ہوں، اینٹوں کو پکڑ کر کوئی غیبی طاقت مجھے اندر کی طرف دھکیل رہی ہے۔ میں مینڈھ سے چپک جاتا ہوں۔ وہ طاقت مجھے اینٹوں سمیت کنوئیں میں پھینک دیتی ہے.... ہول سے میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ جاگنے پر میرا سانس اُکھڑ جاتا ہے۔

"آپ گومتی اور چاچاجی کی فکر نہ کریں" میں بات کا رُخ بدلنے کی کوشش کرتا ہوں۔

"ایسا... ا... ا... ا" کہہ کر انھوں نے مکھیوں سے بچنے کے لیے اپنا سوکھا ہوا بدن چادر میں چھپالیا ہے۔ گومتی دُودھ لے کر آئی ہے... مگر وہ پینا مانتے ہی نہیں... چاچی ہونٹوں میں پاٹھ کرتی ہوئی ایک نظر دیکھ کر لوٹ جاتی ہے۔

"بھتیجے... میری وصیت لکھ دے" وہ میری طرف کروٹ بدل کر کہتے ہیں۔

"لکھو کہ میرے مرنے کے بعد میری ہر ایک چیز کی مالک ٹھاکری ہوگی... اس کے بعد گومتی... میرے مرنے پر کسی بھی براہمن کو کوئی دان پُن نہ کیا جائے.... میری استھیاں گنگا میں نہیں، ستلج میں جل پرواہ کی جائیں۔ جہاں بھگت سنگھ کی استھیاں ڈالی گئی تھیں... جو دو ایکڑ زمین ہے، وہ تم فروخت کرکے روپے اپنی چاچی کو دے دینا... ایک میری ایف ڈی ہے۔ اچھی خاصی رقم ہے۔ وہ میں تجھے دیتا ہوں... اس کے بیاج سے گاؤں کے غریب بچّوں کو کتابیں لے دیا کرنا... نتیجہ نکلنے پر ہر برس آیا کرنا اپنے گاؤں... اس گھر کے ایک حصّے کو لائبریری بنا دینا... اس کا نام اپنے دادا کے نام پر رکھنا۔ لیکن ساتھ پنڈت نہیں لکھنا۔ حکیم لبھو رام لکھنا... ہر برس آنا اپنے دیس، اپنے گاؤں مانوں پور... بھولنا نہیں اس دھرتی کو۔ اس مٹّی کو... او... او... او"

بولتے بولتے چاچاجی رو پڑے۔ وہ بھول ہی گئے ہیں کہ وصیت لکھوا رہے تھے۔ دراصل وہ وصیت لکھوا ہی نہیں رہے۔ وہ تو اپنے اندر پیدا ہوا غبار نکال رہے تھے... کیترین تجھے یاد ہے... ایک بار میں شرابی حالت میں اکیلا لیٹا ہوا خود سے ہی بولتا رہا تھا، سیہہ، سلودی،

سرور پور۔ گوہ، گوسلاں، مالوں پور، تو اسے پنجابی کا کوئی لوک گیت سمجھتی رہی تھی۔ تو تب حیران ہو گئی تھی جب میں نے بتایا تھا کہ یہ کوئی لوک گیت نہیں۔ یہ میرے گاؤں کے ارد گرد کے چھ گاؤں کے نام ہیں جو اس طرح اکٹھا پکارے جاتے ہیں۔ تجھے لوک گیت ہونے کی غلط فہمی اس بات سے ہوئی تھی کہ میں ترنم میں بول رہا تھا۔ میرے ان دیہات کے نام میرے اندر سے محبت کا سُر بن کر نکل رہے تھے۔ لوک گیت ایسے ہی بنتے ہیں۔ یہ ہمارے پسماندہ ملکوں کے لوگوں کی پونجی ہے۔ پیاری کیتھی... میری اور چاچاجی کی یہ باتیں... جذباتی سی باتیں ہیں۔ باؤلی سی لگتی ہیں۔ کسی دانشور کو احمقوں جیسی بھی لگ سکتی ہیں... مگر اس دھرتی پر.... اس گھر میں اگر مجھے مرنا پڑا تو میرا دل بھی... کم از کم اس وقت کی کیفیت کے مطابق... یہی کہتا ہے کہ میں بھی ایسی ہی باتیں کروں۔

تو بھی اپنی دھرتی پر شاید ایسا ہی کچھ سوچے۔

کتنا سکھ اور لطف ہے اس سوچ میں... مگر کتنا دُکھ بھی ملا ہوا ہے۔

میں نہیں چاہتا کہ ملکہ کے دو روپے چاندی کے لاکر میں اپنے بچوں کو یہ سکھ اور دُکھ دُوں۔ اور پھر وہ اپنے بچوں کو دیں۔

اس بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟

تمھارا

گوردیو چند

میڈم

جب چندر رونشی نے شراب کا گلاس فرش پر پٹک دیا تھا۔ میرے سمیت تمام دوستوں کو گالیاں دی تھیں۔ اپنے بوڑھے مسوڑھوں کے آس پاس اکٹھا ہوا، شراب مِلا گندہ سا لعاب میرے پیروں کے نزدیک تھوک دیا تھا... پھر کچھ دیر کے بعد میرے کندھے پر سر رکھ کر ہچکیاں لے کر روئی تھی... تب مجھے لگا تھا کہ اس کی بات سچ ہے کہ میں اُسے تو کیا خود کو بھی ٹھیک طرح سمجھ نہیں پایا۔ اس کی یہ بات بھی ٹھیک ہی لگی کہ میں جو ٹیلی فلم بنانے کی تیاری کر رہا ہوں اس میں میڈم چندر رونشی عرف چندر مکھی عرف چندری، اس کے گھٹیا زدہ خاوند میجر اندر سنگھ شیر گل، نوجوان شاعر درشن کبیر اور میڈم کے دیگر تمام دوستوں کے کردار جو میں نے پیش کرنے ہیں، وہ میرے تخیل کی پیداوار ہی ہوں گے حقیقی نہیں ہو سکتے۔

اس رات اس ذہنی کیفیت میں سوچتے ہوئے مجھے محسوس ہوا تھا کہ میں فیصلہ نہیں کر سکتا کہ اس واقعہ یا المیہ کی ذمہ داری کبیر پر تھی؟ میڈم پر تھی؟ یا ان حالات پر تھی جن میں وہ سب کچھ ہو گیا تھا۔ جن میں ہر روز معصوم لوگ قتل ہوتے ہیں۔ قدم قدم پہ دغا فریب اور بے وفائی ہے۔ پیشہ، شہرت اور ذاتی سُکھوں کی چھینا جھپٹی ہے۔

غلطی میری بھی تھی۔ میری زبان سے وہ بات نکل گئی تھی، جس سے ظاہر ہو گیا تھا کہ میڈم اور کبیر کے درمیان جو واقعہ پیش آیا تھا، اس کا مجھے علم ہے... ہوا اسی طرح تھا کہ میں میڈم کی کوٹھی 'کلا بھون' کی طرف جا رہا تھا۔ سڑک کی ٹیوب کی روشنی میں کبیر نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ اس نے تیزی سے سکوٹر روک لیا تھا۔ اس کا پریشان چہرہ دیکھ کر مجھے شک گزرا تھا کہ وہ میڈم کی کوٹھی سے آ رہا ہے۔ وہاں سے گڑبڑ شروع ہو گئی۔ جب اس نے بڑبڑاتے

ہوئے کہا تھا، "چلو... ہم کہیں بیٹھیں" تو مجھے لگا تھا کہ وہ نارمل نہیں ہے۔ اس کی بائیں آنکھ کا ابرو اور دائیں طرف کا کندھا اونچا نیچا ہو رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ اُسے کچھ ہو گیا تھا۔ محبت، نفرت یا شاعری۔

"شام سے ہی بجھے بجھے سے ہو؟" میری چھیڑ خانی سے بھی وہ مسکرایا نہیں تھا۔ جب اس نے کہا تھا "چلو اب لوٹ چلیں۔ تو لگا تھا کہ وہ اتنا دہشت زدہ ہے جیسے میڈم کی کوٹھی میں آکر انتہا پسندوں نے گولی چلا دی ہو۔ اور وہ برستی ہوئی گولیوں میں سے بچ کر آیا ہو یا سیکورٹی والوں نے میڈم کی کوٹھی کو گھیرے میں لے لیا ہو۔ کبیر دیواریں پھاند کر آیا ہو۔ میں اسی کے ساتھ ہی لوٹ گیا تھا۔ اس کا اسکوٹر شراب کے ٹھیکے کے پاس رک گیا تھا۔ پھر 'آؤ نیل کنٹھ جی' کہتا ہوا ٹھیکے والوں کے احاطہ میں گھُس گیا تھا۔ جلدی سے دو پیگ پینے کے بعد بھی وہ اُکھڑا اُکھڑا سا تھا۔ کچھ بول نہیں رہا تھا۔ آنکھیں بھر آئی تھیں۔ وہ آنسوؤں کو گرنے سے روکے ہوئے تھا... بلآخر میں نے پوچھ ہی لیا تھا۔ "میڈم نے کوئی زیادتی کر دی ہے"

"نہیں..." کہہ کر وہ گلاسوں میں برف کے ٹکڑے ڈالنے لگ گیا تھا۔

"پھر کبیرا۔ تم کیوں ہوئے اُداس؟ گلاس اُٹھاؤ..." میں نے بزرگوں کی طرح اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا تھا تو اس کی آنکھوں میں ستارے سے چمکنے لگے تھے۔

"مجھ سے ہی... کچھ ہو گیا ہے" وہ بتانے لگا تھا۔ غلطی یا کچھ اور.. جس کا مجھے افسوس سا بھی ہے اور نہیں بھی... میں نیل کنٹھ جی... آپ کو کیا بتاؤں؟ پتہ نہیں کہ قصور میڈم کا ہے یا میرا؟... پتہ نہیں وہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟ کیونکر ہو گیا؟ بس ہو گیا ایک دم۔

"میں ایک یا پون گھنٹہ پہلے وہاں گیا تھا۔ پہلے تو آغاز ہی غلط ہوا تھا... اس کی کتیا 'جوسی' نے ہی ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا... میڈم اپنی اسٹڈی میں تھیں۔ ٹیبل لیمپ کی مدھم سی روشنی تھی۔ میں کرسی پر بیٹھنے لگا تو جوسی کی ٹانگیں میرے پاؤں کے نیچے آگئی تھیں۔ اس نے چیختے ہوئے چھلانگ مار کر میری تو جان ہی نکال دی تھی۔ میں خوف سے بے حال ہو گیا۔ میڈم مجھے سنبھالنے کے بجائے ہنستی ہوئی جوسی، جوسی کہتی ہوئی باہر نکل گئی... پھر مجھے دیکھ کر ہنستی رہی۔ میں نے دروازہ بند کر دیا۔ میڈم نے آکر رسمی طریقہ سے 'سوری' کہا اور مجھے پانی کا گلاس تھما دیا... جب

باہر کہیں گولیاں چلیں تو وہ سہمی چیختی چلاتی ہوئی دروازہ پیٹنے لگی۔ میڈم نے نوکرانی سوما کو آواز دی۔ تب میری خلاصی ہوئی۔

"پھر میرا دل نارمل کرنے کے لیے میڈم دو پیگ بنا کر لائی۔ پھر ایک ایک اور لے کر ہم ٹی وی اور فلم میڈیا کے فرق کی باتیں کرنے لگے۔ وہ بہت سلیقہ سے جیسے کہ اس کی عادت ہے، مجھے سمجھاتی رہی۔ یونانی اور بھارتی ناٹ شاستر کے حوالے دیتی رہی۔ اس کا اتنا بڑا اور گہرا مطالعہ مجھے متاثر کرتا رہا۔ لفظ کے بولنے، سننے اور اس کے ساتھ بنتے بگڑتے مناظر کو دیکھ کر جو لطف ملتا ہے اُسے وہ اپنے ہاتھوں، انگلیوں اور چہرے کی حرکتوں سے مدرائیں بنا بنا کر سمجھاتی رہی...

"پھر ہم... نہیں ہم نہیں... میں ہی اس بحث میں اُلجھ گیا کہ بدلتے ہوئے حالات نے ہیرو اور ہیروئن کے تصوّر کو ہی بدل ڈالا ہے؟ میں اس بات پر اڑ گیا کہ نئے ادیبوں نے اس تصوّر کو توڑا ہے۔ یہاں تک کہ نیل کنٹھ جی نے اس تصوّر کو بدلا ہے۔ وہ بھی اس بات پر بضد رہی کہ ہیرو بنیادی طور پر وہی ہے... پھر وہ میری طرف دیکھ کر ہنسنے لگی۔ جیسے میری احمقانہ بات پر ہنس رہی ہو۔ کہنے لگی "چلو چھوڑو۔ باقی بات نیل کنٹھ کے آنے پر کریں گے۔ اب تم کوئی نظم سناؤ۔" کہہ کر اس نے گلاس اُٹھا کر منہ سے لگا لیا۔ میری طرف دیکھ کر بہت پیار سے مسکرائی۔ اُس وقت وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اس کا بھرا بھرا جسم سانولا مگر چمکتا چہرہ بہت جاندار عورت کا روپ لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے سے وہ کچھ ٹپک رہا تھا جسے آپ کیا کہا کرتے ہیں، ہاں جاہ و جلال... پھر میں نے اپنی وہ نظم سنانا شروع کر دی، وہ پرسوں والی "ہیرے جڑی مورتی"۔"

"اچھا... جس میں کھنڈت مورتی کو توڑ کر پھر سے پرتشٹھا پران دینے والی بات ہے۔"

"ہاں جی... وہی۔ میں نظم سناتا رہا اور وہ ہائے۔ واہ کہتی رہی۔

"نظم ختم ہونے پر وہ مجھے جذبات سے عاری نظر سے دیکھتی رہی... پھر اُٹھی، بائیں ہاتھ میں پیگ لے کر۔ پھر اس نے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر پیگ میرے منہ کو لگا دیا۔ میں نے ذرا سا سِپ کیا... مگر جناب اس نے 'مائی ڈیر' کہتے ہوئے اپنے دونوں ہونٹ میرے ہونٹوں سے

چپکا دیئے ... تب مجھے لگا تھا کہ اس نے اپنے بوڑھے ہونٹوں سے شراب ملا گندہ سا لعاب بڑی بڑی درزوں والے دانتوں میں سے نکال کر میرے منہ میں انڈیل دیا تھا۔ ... مجھے بے حد کراہیت سی محسوس ہوئی۔ قے آنے کو ہونے لگی ... پھر جناب اپنے منہ میں آئے اس لعاب کو میں نے فرش پر تھوک دیا ... اسے دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ جیسے وہ بدشکل بڑھیا ہے۔ اس کے گلے کے نچلے حصے میں، آنکھوں کے نیچے، پیشانی پر اور کانوں کے پاس جھرّیاں ہی جھرّیاں ہیں ... 'نان سنس' میرے منہ سے نکلا اور میں رومال سے منہ پونچھتے ہوئے سیڑھیاں اُتر کر بھاگ آیا۔ ...

"ہاں۔ ہاں ... ہوسکتا ہے کہ اس کی نیت نیک ہو۔ کوئی بُرا جذبہ شامل نہ ہو۔ مگر آپ ذرا سوچیں، میری پوزیشن میں بیٹھ کر ... کسی کا تھوک تمھارے منہ میں۔

"آپ کی بات ٹھیک ہے۔ میں اُن کو اپنے گورو سمان مانتا رہا۔ ریڈیو، اسٹیج، ٹی وی پر رول کرتے ہوئے ان سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ میرے دل میں بہت احترام ہے ان کے لیے...

"جی ہاں، یہ بھی ہوسکتا تھا کہ میں اس کے پیار کا جواب پیار سے دیتا ... ہوسکتا تھا کہ میں اس کی اس حرکت کو اپنے پر احسان مان لیتا۔ لیکن غصّے کی آتش بازی سی میرے دماغ میں سے تیزی سے نکل گئی۔ میں کچھ سوچنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا" کبیر بات سُنا کر بھی گھبرایا ہوا تھا۔

"دیکھو کبیر — اس کی وجہ کوئی بھی ہوسکتی ہے"! میں نے نوجوان کو سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

"کوئی گانٹھ ہوسکتی ہے تمھارے دماغ میں پھنسی ہوئی۔ جیسے کہ تمھیں چھوٹی عمر میں اس نے جھڑکا ہو۔ تو نے ... تو نے کبھی اس کے نزدیک ہونے کی کوشش کی ہو۔ اس نے تجھے روک دیا ہو۔" میں نے اسے پُرسکون کرنے کے لیے پیار بھری بات کے بیچ میں سے تیر چھوڑا تھا۔

"ایسی کوئی بات یاد تو نہیں، مگر ہوسکتا ہے نیل کنٹھ جی، کچھ ہوا ہو۔ لیکن میں نے ان کو کبھی اس نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ میں کافی عرصہ سے مدّاح رہا ہوں ان کا ... ہاں ... البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ یہ بات مجھے چبھتی رہی ہے کہ میڈم آئے دن نئے نئے دوستوں کے ساتھ گھومے۔ کافی ہاؤس میں لوگ ان کی باتیں کریں کہ کس کے ساتھ اس کا تعلق کس حد تک ہے؟ اب نمبر ایک کون ہے اور نمبر ۲ کون۔ وہ پھر نمبر ۳ کیسے ہوگیا؟ آج کل وہ کس پر ڈائریکٹر پر مہربان ہے؟

اسٹیشن ڈائریکٹر پر اب مہربان کیوں نہیں رہی؟... کئی بار مجھے ایسا لگنے لگتا ہے کہ وہ باتیں میرے کسی سگے رشتہ دار کے بارے میں ہو رہی ہیں۔ لوگ وہ باتیں مجھے سناتے ہیں۔ مجھ سے یہ سب کچھ برداشت نہیں ہو رہا۔ نہ تو میں میڈم کو کچھ کہہ سکتا ہوں اور نہ ہی لوگوں کو... یہ احساس بھی پرانا سا ہے... میں تو میڈم کے پاس یونہی چلا گیا تھا۔ پچھلے کئی روز سے معصوم لوگوں کے ہو رہے قتلِ عام سے ٹینشن بڑھ گئی تھی۔ کسی اچھے انسان کے ساتھ بات کرنے کو دل چاہتا تھا۔"

رات اتنی نہیں بیتی تھی۔ بُرے حالات کی وجہ سے سڑک ویران ہو گئی تھی۔ سیکورٹی فورسز کے جوان گلیوں میں پھر رہے تھے۔ لوگ کسی بھی طرف سے آنے والی گولی کے ڈر سے اپنے گھروں میں چھپے بیٹھے تھے۔ جب کبیر باتیں کر رہا تھا تو میرے تصوّر میں جس طرح میڈم تڑپ رہی تھی وہ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ میں جلدی اس کے پاس جا کر اس کی دلجوئی کرنا چاہتا تھا۔

"اچھا... چلو اب چلیں... پرماتما تمھیں میڈم جتنا حوصلہ اور عقل سلیم دے۔" میں نے کبیر کو آشیرواد دینے جیسے ڈھنگ سے کہا تھا۔

اسکوٹر اسٹارٹ کرنے سے پہلے اس نے میرے نزدیک ہو کر کہا تھا "نیل کنٹھ جی۔ اِدھر گولی چلی تھی۔ پولیس والے ہر شخص کو گھیرے میں لے رہے تھے۔ آپ ادھر نہ جائیں... اور اب تو ڈھابے بھی بند ہو گئے ہیں۔ میرے گھر جا کر ہی دو پھلکے کھا لینا... مگر آپ نے میڈم کے گھر جانا ہی ہے تو کھانا کھا کر وہیں سو جانا۔" کہہ کر اس نے میری طرف دیکھا تھا۔ پھر مجھے تذبذب میں دیکھ کر تیز رفتار نوجوانوں کی طرح کِک مار کر اُڑ گیا تھا۔ تب تک میرے بوڑھے ہوتے جا رہے دماغ نے فیصلہ کر لیا تھا۔ اور اب میں اکیلا 'کلا بھون' کی طرف چل پڑا تھا۔

انتہا پسندوں کی گولیوں اور بموں سے میں اتنا نہیں ڈرتا جتنا کبیر۔ دراصل وہ دوشیزہ سی اپنی بیوی اور کھلونے جیسے بچّے کا باپ ہے۔ اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا ہے... میرا کیا ہے؟ اکیلا رہتا ہوں۔ کہیں بھی کھانا کھا کر کسی بھی جگہ سو رہوں گا۔ اگر مجھے کسی کے ساتھ لگاؤ کا احساس ہوا ہے تو وہ چندر رونشی ہے۔ جس کو میں پیار سے چندر مکھی کہتا ہوں اور اس

کا شوہر میجر شیر گل 'چندڑی' کہتا ہے...

پتہ نہیں کیا حالت ہو گی اس بے چاری کی؟ کبیر بھی کیسی شرط لگا کر گیا ہے۔ میڈم کو پتہ نہ چلے کہ ہم نے اس واقعہ کے بارے میں کوئی بات کی ہے۔ لیکن وہ کوئی حقیر سی بات ہے کہ پی جاؤں؟... سارا واقعہ میرے ذہن میں گھوم رہا تھا۔ کیمرے کے لانگ شاٹس اور کلوز اپوں سے ایک ایک حرکت نمایاں ہو رہی تھی۔ ڈائیلاگ بولے جا رہے تھے۔ میڈم کی آنکھوں میں پیار چھلکتا تھا۔ کبیر کی بائیں آنکھ کا ابرُو اور دایاں کندھا اونچا نیچا ہو رہا تھا.... اس بے چارے کا بھی کیا قصور ہے؟ وہ میڈم کے بیش رنگ پیار اور پیار کی لامحدود بھوک کو سمجھتا ہی نہیں۔

میں ڈر رہا تھا کہ اتنے نوجوان لچکتے ہوئے دلوں کو رَدّ کرنے والی میڈم اپنی زندگی کی اس اتنی بڑی شکست کو برداشت کیسے کر سکے گی؟ وہ پتہ نہیں کیا کر بیٹھے؟... یہ سوچتے ہوئے اس کا بوڑھا ہو رہا چہرہ میرے سامنے آ گیا تھا۔ جسے دیکھ کر ایک بار تو مجھے خوشی بھی ہوئی تھی۔ شاید یہ سوچ کر کہ آج وہ مغرور ناک نیچی ہو گئی ہے۔ جس نے پتہ نہیں کتنے دوستوں کے دل توڑے ہیں۔ مجھے بھی سیڑھیوں میں روک کر انتظار کرا کے ذلیل کیا ہے۔ کبھی یہ نہیں سوچا کہ کسی دوسرے کے سامنے کی گئی کسی کی بے عزتی دُگنی ہو جایا کرتی ہے۔ مگر اس کی تمام بُرائیاں اس وقت دُھل جاتی ہیں جب وہ پاؤں کے ناخن سے سر کے بال تک محبت میں بھیگ جاتی ہے۔ یہی بات سوچ کر میں اس کا تیہرواں دوست ہو کر بھی پہلا ہی ہوں۔ ویسے بھی عمر کے اس دور میں ہمارے درمیان وہ رشتہ بن گیا ہے جسے لوگ دُکھ سُکھ کا ساتھ کہتے ہیں۔

چندر ونشی نے میرے ساتھ ایک اور رشتہ بھی جوڑ رکھا ہے۔... ایک بار اس نے بہت پگھلی سی حالت میں بڑے پُر اسرار ڈھنگ سے مجھے بتایا تھا کہ شانتی نکیتن میں تعلیم حاصل کر رہی اس کی بیٹی شبنم میجر کی اولاد نہیں، میری بیٹی ہے۔ یہ جھوٹی کہانی اس نے مجھے خوش کرنے کے لیے گھڑی تھی یا اپنے آپ کو کوئی جھوٹی تسلّی دینے کے لیے، کچھ کہہ نہیں سکتا کیونکہ

ہمارے درمیان ایسا رشتہ شبنم کے پیدا ہونے کے بعد قائم ہوا تھا۔ شبنم کا رنگ بہت گورا اور نین نقش تیکھے ہیں۔ جو میں نے اس گھر میں آنے جانے والے کسی بھی شخص کے نہیں دیکھے... تو بھی میں نے میڈم کی وہ بات قبول کر لی تھی اور شبنم کو بیٹیوں کی طرح ہی پیار کیا ہے۔ اُسے پہلے دھرم شالہ اور پھر شانتی نکیتن میں مَیں ہی داخل کرا کے آیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوٹھی میں آنے جانے والے ہرا یرے غیرے کی نظر میری بیٹی پر پڑے۔

میں نے 'کلا بھون' کے گیٹ کو ہاتھ لگایا تو وہ خود بخود کھُل گیا۔ شاید کبیر جلد بازی میں بند کرکے نہیں گیا تھا۔ میں اپنا اسکوٹر کھڑا کرکے ریلوے کے پُل جیسی سیڑھیاں چڑھنے لگا تو 'جُوسی' میری ٹانگوں سے چپک گئی۔ بے چاری کبیر کی ڈرائی ہوئی تھی۔ میڈم کی نوکرانی سوما یہ ظاہر کرنے کے لیے کھانسی تھی کہ وہ جاگ رہی ہے۔

جہاز کے ڈیک جیسے طویل چھجّے پر کھڑے ہو کر مجھے لگا تھا کہ آج کے واقعہ کی ایک کردار یہ جُوسی بھی ہے۔ خدا جانے کبیر کے دل میں تلخی اس نے ہی بھر دی ہو۔ یا شاید میڈم نے وہ حرکت کبیر کو جُوسی کے سبب پیدا ہوئی بے لطفی سے بچانے کے لیے ہی کی ہو... کبیر نے کہا تھا ... میڈم آپ کی بات بتائے گی تو صرف اتنی کہ میں نے کبیر سے پیار کا ذرا سا اظہار کیا۔ اپنے بچّے کی طرح تو وہ ناراض ہی ہو گیا۔

اس کوٹھی میں سب ایک دوسرے کے قدموں کی چاپ پہچانتے ہیں۔ جب میں سیڑھیوں پہ چڑھ رہا تھا تو سوما نے کہا ہوگا... "آ گیا میڈم کا رکھیل"، چندر رولشنی نے کہا ہوگا: "اب آیا ہے 'لو مین داس'"۔ کوٹھی کے نچلے حصّے میں پڑے اس کے گنٹھیا زدہ خاوند میجر شیر گل نے کہا ہوگا۔ "آ گیا ٹھگ، زبان کی کمائی کھانے والا"... اس کا نوکر سورم سنگھ خاموش رہا ہوگا۔ اس کلا بھون میں چندر لکھی کے بعد وہ دوسرا فرد ہے جو میرے ساتھ گھُل مل سکتا ہے۔ وہ شریف پہاڑی شخص مجھے ہمیشہ 'نیل کنٹھ جی' کہہ کر پکارتا ہے۔ اب تو میجر شیر گل بھی مجھے اس گھر کا فرد ہی سمجھنے لگا ہے۔ تقریباً بارہ برس پہلے وہ مجھے گولی مار دینے کی تاک میں رہتا تھا۔ جب اُسے گنٹھیا ہوا تو میں نے اور سورم سنگھ نے ہی اس کی دوا دارو کی تھی۔

ناک صاف کرنے کی آواز سے مجھے پتہ چلا تھا کہ میڈم اپنی اسٹڈی میں ہے۔ میں دروازے

ہلکی سی دستک دے کر اندر گیا تھا۔ وہ دیوان پر اوندھے منہ اور بکھری سی پڑی تھی۔ میں نے ٹیوب جلائی تو اس نے غصّے بھری نظر سے مجھے دیکھا تھا۔ اور سیدھی ہو کر نائٹی کے پلّو سے اپنی ننگی ٹانگ ڈھانپ لی تھی... میڈم کو اس عمر میں یہ فوٹو فوبیا پتہ نہیں کیوں ہو گیا ہے؟ اتنے برس اسٹیج اور ٹی.وی اسٹوڈیو کی تیز روشنیوں اور کیمرے کی فلیش کے سامنے کام کرنے کے بعد یہ روشنی سے ڈر کیوں؟

اس کا میک اپ جو ہر شام اسٹیج کی ہیروئن کی طرح گہرا ہوتا ہے، میلا سا پڑا تھا۔ کاجل گھُل کر سُرخی میں مِل گیا تھا۔ وہ مِلا جُلا رنگ کچھ چہرے پر اور کچھ تکیے کو لگا ہوا تھا۔ اس کا بھاری چہرہ اور موٹی آنکھوں کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے۔ اس کے بال جو کبھی کندھوں کے اوپر سے بکھر کر ساری کو ڈھانپ کر نیچے تک لٹکے ہوئے ہوتے تھے، گچھے بنے سرہانے پر پڑے تھے۔ مجھے کوئی بات نہ سوجھی تو دھیرے سے کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ سوچ سوچ کر بولا تھا۔

"اپنے نئے ڈرامے کی ہیروئن کا کردار میں نے ایسا تو نہیں سوچا تھا۔"

"کرشن، مجھے تنگ نہ کر... اچھا ہو کہ تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔" وہ تھکی سی آواز میں انگریزی میں بولی تھی... ہم اکیلے میں ملیں تو وہ مجھے نیل کنٹھ نہیں اصلی نام سے پکارتی ہے۔ خوشی کی رو میں ہو تو لمبن داس، کہہ دیتی ہے۔ اس کے بدلتے ہوئے موڈ کو میں رب کے رنگ کہتا ہوں۔

اس نے جو بات کہی تھی اس کا مطلب میں نے یہ لیا تھا کہ اپنا ڈرامہ نگار، ایک طرف رکھ دوں اور دوست کی صورت ملوں۔ اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو، کا مطلب ہے کہ اب تم میرے پاس سے نہ جانا۔ اس نے روشنی سے بچانے کے لیے اپنے چہرے کے اوپر بانہہ رکھ لی تھی اور آہ بھر کر پھر اوندھی ہو کر لیٹ گئی تھی۔

میڈم جینڈر رونشی لگ بھگ... پندرہ برس سے اپنے شوہر میجر شیر گل سے الگ رہ رہی ہے۔ جب میجر کو گنٹھیا نہیں ہوا تھا تو ان میں لڑائی جھگڑا ابھی ہوا کرتا تھا۔ کبھی میڈم کے اسٹیج پہ کام کرنے کی بنا پر، کبھی رات کو دیر سے آنے کے سبب، تو کبھی نوکروں کے کام کی وجہ سے۔ یہ سب باتیں تو بہانے ہی تھے اصلی بات تو اور ہی تھی۔ اُن دنوں ڈائننگ ٹیبل کی پلیٹیں بھی ٹوٹتی تھیں،

اور برآمدے کے گملے بھی پھوٹتے تھے۔ مگر میجر میڈم پر کبھی بھی ہاتھ نہیں اٹھاتا تھا۔ وہ اس وقت بھی میڈم سے پندرہ برس بڑا لگتا تھا۔ حالانکہ فرق صرف نو برس کا تھا۔ ان دنوں ہمارے دوستوں کے دائرے میں یہ بات چلا کرتی تھی کہ جب میڈم میجر کے سامنے لڑنے کے لیے کھڑی ہوتی ہے تو بالی کی طرح اس بڈھے کی آدھی طاقت میڈم میں آجاتی ہے۔
میجر بڑبڑ بھی کرتا ہے مگر صرف سورم سنگھ کے پاس یا کبھی میرے سامنے۔ مجھے وہ بڈھا بھی ہمدردی کے قابل لگتا ہے۔ میں اس کی وہ گالیاں بھی سن لیتا ہوں جو دیتا تو دوسروں کو ہے مگر جڑتی میرے ساتھ بھی ہیں۔

شکر ہے کہ ان کے لیے روپے پیسے کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ مارکیٹ کی کئی دکانوں کا کرایہ آجاتا ہے۔ ہماچل میں چندر ونشی کا اپنا باغ ہے۔ جو اُسے اپنے باپ کی جائیداد میں سے ملا ہوا ہے۔۔۔ کتنی نعمتیں دی ہوئی ہیں۔ رب نے چندر ونشی کو روپ دیا، ایکٹنگ کا فن دیا، عقل دی، دل دیا اور لڑکیوں والا گلا دیا۔۔۔ یہ جب ریڈیو اور ٹی وی پر کسی سے ہنس کر ملتی ہے یا ہاتھ ملا لیتی ہے تو لوگ کتنے بھرم پال لیتے ہیں۔ ایسا ہی ایک بھرم ریڈیو کے ایک اسسٹینٹ ڈائریکٹر نے پال لیا تھا۔ ریڈیو اسٹیشن کے سالانہ جلسہ میں چندر ونشی نے شوقیہ فنکار کے طور پر کھلی اسٹیج پر اپنے پورے موڈ میں آکر ادائیں دکھا کر' ماہیا' گایا تھا۔ دُبلا پتلا ساوہ اے ایسی ڈی گیٹ سے باہر نکلتے ہی لسوڑے کی گٹھلی کی طرح ساتھ چپکنے ہی لگ گیا تھا تو چندر ونشی نے اس کا کندھا پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے کہا تھا" بتاؤں تجھے کہ کومل اور تیبر سُر کیا ہوتے ہیں؟۔۔۔ ناک کی سیدھ میں گھر جا کر اپنی بی بی کے گھٹنوں سے لگ کر بیٹھ جا۔"۔۔۔ پھر کتنا ہی عرصہ چندر ونشی تو کیا اس نے میرے سامنے بھی آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔

دیوان کے آدھے حصے میں پھیلی ہوئی چندر ونشی کو دیکھ کر مجھے لگتا تھا کہ کوئی لاش پڑی ہے۔ اس کی موت ابھی ابھی کسی صدمہ سے ہوئی ہے۔ میں سوچنے لگ گیا تھا کہ اس کی ارتھی نیچے کیسے اتاریں گے؟۔۔۔ پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے کہ لیٹے ہوئے ہر ایک بڈھے کو دیکھ کر مجھے اس کی موت کا خیال آجاتا ہے۔۔۔ مجھے اپنی ارتھی بھی مرگھٹ کی طرف جاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

جب میں نے دیکھا کہ چندر رونشی مجھے لگاتار دیکھے جا رہی ہے تو مجھے ایک دم اس کے دُکھ کا خیال آ گیا تھا۔ جو کبیر اپنی ناسمجھی کے سبب اس کے دامن میں ڈال کر چلا گیا تھا۔ اسے ختم کرنے کا چارہ کرنے کے لیے میں آیا بیٹھا تھا ئیں۔

"اٹھو میری جان۔ تم خاموش ہوتی ہو تو یہ ساری کائنات اداس ہو جاتی ہے۔" اس کے بازو پر ہاتھ پھیرتے ہوئے میں نے کسی ناٹک کا ڈائیلاگ بولا تھا "بس اتنی سی تنہائی سے جذباتی من ڈھیر ہو گیا ہے" کہہ کر میں نے ظاہر کیا تھا کہ میرے لیے اس کے دُکھ کا سبب تنہائی ہے۔ کبیر والے واقعہ کا مجھے کوئی علم نہیں ہے۔ پھر میں نے ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا تھا "تو ہزاروں سامعین و ناظرین کی محرّک ہو۔ تجھ سے طاقت پا کر میں نے جینا سیکھا ہے۔ ورنہ یہ تیرہ کلا سمپورن پانچ تتو کا پتلا کب کا مٹّی کا ڈھیر ہو چکا ہوتا ..."

وہ ذرا مسکرائی تھی۔ شاید میری مسخروں جیسی اداؤں پر۔ میں نے حوصلہ کر کے اپنے رومال سے اُس کے آنسو پونچھ دیئے تھے۔ ہلکے سے ہونٹ لگا کر اس کا ماتھا چوم لیا تھا۔

آج کل اس دنیا میں شاید مَیں ہی ہوں جو میڈم کے کسی بھی حصّے پر لگی چوٹ پر مرہم لگا سکتا ہوں اور اپنے لگوا سکتا ہوں ... یہ بات ہم میں سے کسی کی کوئی حصولیابی نہیں، زندگی کے حالات سے پیدا شدہ ضرورت کا نتیجہ ہے۔

اس طرح دُکھی میڈم کو دیکھ کر مجھے ٹی۔ وی کے کھیل 'حویلی' کا وہ منظر یاد آ جاتا ہے جس میں رول کرنے کے لیے میڈم کی بے حد تعریف ہوئی تھی۔ اخباروں نے بڑی بڑی تصویروں کے ساتھ رائٹ اَپ شائع کیے تھے۔ اسی برس ایک بڑے ادارہ نے میڈم کو سال کی بہترین اداکارہ کا ایوارڈ دیا تھا۔ میرے لکھے اس کھیل میں چندر رونشی نے اس ملکہ کا رول کیا تھا جو اپنے دربان پر عاشق ہو گئی تھی۔ مگر اظہار نہیں کر سکتی تھی۔ اس اذیت میں پاگل ہو کر وہ اپنی سلطنت چھوڑ کر دربان کے ساتھ کہیں بھاگ جانے کی ترکیبیں سوچتی ہے۔ بلا آخر وہ اس عذاب کو روحانیت کا جامہ اوڑھا کر کسی مزار پر جا کر اپنے پیر و مرشد سے کہتی ہے ــــ "دیکھو میرے من میں ویراگ کیسے پیدا ہوا؟ جب میں نے لوگوں کو کتّوں کی طرح ایک دوسرے سے ٹکڑا چھینتے ہوئے دیکھا۔ انسان کو انسان کے خون کا پیاسا دیکھا۔ میں پانی سے نکالی ہوئی مچھلی کی طرح

تڑپی۔ مجھے دنیا کی ناپائیداری کا خیال آیا۔ مجھے لگا کہ دنیا کے چاروں کھونٹ کانپ رہے ہیں۔ میرے دل میں اندھیرا بھر گیا۔ میں نے چاہا کہ کوئی ایسی جگہ چاہیے جو ان ناپاکیوں سے پاک ہو.... میں آپ کی قدم بوسی کو آئی ہوں"۔... کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے پاؤں ننگے کر کے قدم بوسی کرنے کے لیے جھکا تو میڈم نے اپنے پاؤں کھینچ لیے۔ اور کہا "یہ کیا بکواس ہے۔ بند کرا اپنی فضول ڈایئلاگ بازی"۔

اس کے ہنسنے پر مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ اور اس کو یقین ہو گیا تھا کہ اِسے کبیر والی بات کا کچھ علم نہیں۔ پھر وہ میرے ہاتھ کے ذرا سے سہارے سے اُٹھ بیٹھی تھی۔ میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تھا "تم فیض کا وہ کون سا شعر پڑھا کرتے ہو۔ گر دل ہے کہ اس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی...؟"

"ہاں۔ وہ ہے... کئی بار اس کا دامن بھر دیا حُسنِ دو عالم سے۔ مگر دل ہے..."

"اچھا میں نہا لوں ذرا۔ پھر بھرتے ہیں دل"۔ کہہ کر وہ چستی سے دیوان سے اُتر کر چلی گئی۔ اور میں میجر شیر گل سے ملنے کے لیے سیڑھیاں اُتر گیا تھا۔

ریوے کے پُل جیسی سیڑھیوں کے نیچے کھڑے ہو کر مجھے خیال آیا تھا کہ میں نے جو ٹیلی فلم بنائی ہے۔ اس کا بڑا حصہ اس کوٹھی میں شوٹ کیا جا سکتا ہے۔ کتنی شاندار لوکیشن ہے۔

میجر کے کمرہ میں جا کر میں نے اونچی آواز میں ست سری اکال کہی تھی۔ تاکہ وہ آواز سے ہی مجھے پہچان لے۔ وہ پہیّوں والی کُرسی پر بیٹھا ہوا مجھے موٹے شیشوں والی عینک میں سے دیکھتا ہوا ہنسا تھا۔ اس نے بنیان پہن کر گیلسوں کے ساتھ نکر ٹانک رکھی تھی۔ اس کا گنجا سر، رانوں پر مُردہ سے پڑے مُڑے تُڑے ہاتھ اور کرسی کے پائیدان پر پڑے پاؤں تیل سے چُپڑے ہوئے تھے۔ مالش کرنے کے بعد سورم سنگھ ایک طرف بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ اس نے ایک کرسی کھینچ کر میجر کے نزدیک کر دی تھی۔

"سُنا بھئی نیل کنٹھ؟" کہہ کر جب وہ پھُسکا سا مار کر ہنسا تھا تو اس کے منہ میں سے نکلی پھونک سے چوہے جیسی اس کی مونچھوں کے بال کھڑے ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ اس نے مجھے 'نیل کنٹھ' بھی ویسے ہی کہا تھا جیسے 'ٹھگ' کہتا ہے 'ڈھگ'، وہ پیار سے کہتا ہے یا غصّے میں سمجھنا مشکل

ہے... اس روز وہ خوش تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی تھی۔ شاید اس لیے کہ اس بوڑھے کے دُکھوں کا ایک سبب میں بھی ہوں۔ میں اس کا حق مار کر بیٹھا ہوا ہوں۔ میڈم کو اسٹیج اور ٹی۔ وی پر لے جانے والا میں ہی ہوں، ورنہ پتہ نہیں وہ کیا ہوتی؟ کچھ میری دوستیاں اور کچھ اس کی آواز۔ خوبصورتی اور اداکاری کی صلاحیت کے سبب وہ اتنی بڑی آرٹسٹ بن سکی ہے۔ اُن دنوں میجر مجھے دیکھ کر ہی جل جاتا تھا اور کبھی اپنے قریبیوں کی طرح کہتا تھا۔ رات کو اِسے اپنے ساتھ لے کر آنا۔"

اب بوڑھے کو نزدیک بیٹھا ہوا آدمی بھی بمشکل دکھائی دیتا ہے۔ مگر کان بہت پتلے ہیں اس نے اپنے پاس ٹیپ ریکارڈ بھی رکھا ہوا ہے۔ جس کا تار اس نے پتہ نہیں کیسے اور جوڑ رکھا ہے۔ ہوسکتا ہے، وہ جھوٹ ہی کہتا ہو۔ مگر یہ سچ ہے کہ اس کے پاس بہت سے کیسیٹ یہاں آنے جانے والوں کی آوازوں سے بھر کر رکھے ہوئے ہیں۔ جب وہ میڈم کو چندری، کہہ کر میرے پاس اس کے خلاف باتیں کرتا ہے تو اس کے چہرے پر کھیج نہیں ہوتی، بلکہ مسکراتا رہتا ہے۔ شاید اپنی خفیہ جانکاری پر یا اپنی اس حصولیابی پر اس وقت وہ بوڑھا بچوں کی طرح معصوم اور پیارا لگتا ہے جو صرف اس بھرم میں خوش ہے کہ وہ میڈم کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔

یہ بوڑھا بھی میری ٹیلی فلم کا ایک کردار ہے۔ اس کا کمرہ ایک سیٹ ہے جس میں قدیم زمانے کے اپنے پُرکھوں کی تصویریں، بندوقیں، تلواریں، ہاتھی دانت یا چاندی کے مُوٹھوں والی کٹاریں، شیروں اور ہرنوں کے سر، پرانا فرنیچر، پھلکاریاں اور باغ، بڑے بڑے پایوں والے پلنگ۔ کانس کے کٹورے، پیتل کی نقاشی والے برتن اور کتنا ہی کچھ الّم غلّم بھرا پڑا ہے۔ یہ سارا سامان میجر ریٹائر ہونے کے بعد اپنے گاؤں سے اٹھا لایا تھا۔ ان کے ساتھ ہی بوڑھے کے پاس کہانیاں ہیں۔ جنگوں کی، جاگیردار بزرگوں کی، عیاشی کی اور چندر روتی کے ساتھ ہوئی شادی کی۔ جو وہ مجھے سُنا کر اکثر بھول جاتا ہے۔ وہ کون سی بات کتنی بار سُنا چکا ہے۔ بڈّھے کی زبان کی کیسیٹ چلتی رہتی ہے اور میں اَن سُنی کر کے اپنی فلم کے شاٹس کی باریکیاں سوچتا رہتا ہوں۔ جب کبھی سوُرم سنگھ میری بے بسی پر ہنستا ہے تو میں اُسے

روک دیتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ بوڑھا میری اتنی سی بات پر خفا ہو جائے۔

"سچن ٹھگ جی۔ ٹیپ سناؤں؟" اس نے مجھ سے پوچھا تھا اور میری 'ہاں' کا انتظار کیے بغیر ہی بٹن دبا دیا تھا۔ بہت ہی اُلجھی سی اور بگڑی آوازیں سنائی دی تھیں۔ وہ نئے سال سے پہلے کی رات کو میڈم کے کمرے میں ہوئے جشن کی ریکارڈنگ لگتی تھی۔ مردوں اور عورتوں کی ملی جلی آوازیں تھیں۔ گانے بھی گائے جا رہے تھے۔ کبھی کبھی 'چیخ' کی سی آواز سنائی دیتی تھی تو مجھے متوجہ کر کے کہتا "سنا کچھ؟"

مگر میری توجہ کسی اور طرف تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ ایک روز انتہا پسند آئیں گے اور ایسی ریکارڈنگ سن رہے بوڑھے کو گولی مار کر اس کی دو نالی بندوق اور دوسری چیزیں چھین کر لے جائیں گے۔ سورم سنگھ بے چارہ مفت میں مارا جائے گا۔

اب سربجیت کی شادی کے بارے میں کیا کہنی ہے چندری۔ بولو رانی؟ ٹیپ بند کر کے اس نے مجھ سے پوچھا تھا۔ میجر شیر گل 'شبنم کو سربجیت کور' اور چندر ونشی، کو چندری' اور رانی کی جگہ بولو رانی کہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کے جیتے جی نپٹ جائے یہ کام۔ تاکہ وہ اپنے خاندان کی نشانیاں اور جائیداد اپنے داماد کے حوالے اپنے ہاتھوں کر کے چلا جائے۔ مگر اسے کیا معلوم کہ اس معاملے میں شبنم شاید اپنی ممی کو بھی نہیں پوچھے گی اور یہ کام اپنے طور پر ہی کر کے گھر آجائے گی۔

ویسے تو میڈم بھی چاہتی ہے کہ شبنم کو کسی اچھے انسان کے پلّو سے باندھ دیا جائے۔ اس کے بارے میں وہ میرے ساتھ بھی مشورہ کرتی رہتی ہے۔ جو بھی خوبصورت، نیک اور سمجھدار فن کار ہمارے رابطہ میں آتا ہے ہم اسے اپنے داماد کی صورت میں دیکھنے لگتے ہیں۔ اس کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے میڈم کے چہرے پر ماں کا اصلی روپ اُجاگر ہو جاتا ہے۔

"اچھا میجر صاحب" کہہ کر میں اوپر چلا گیا... ڈائننگ کم ڈرائنگ روم میں میڈم میرا انتظار کر رہی تھی۔ سلاد اور سیب کاٹنے کا کام ختم ہو چکا تھا۔ نئے اور شوخ میک اپ میں وہ دکھنی بھارت کی رقاصہ لگ رہی تھی۔ اس کی مغرور ناک میں پڑے کوکے کا نگینہ چمک رہا تھا۔ مگر اس کی آنکھوں میں وہ پہلے والی چمک نہیں تھی۔ اس نے اپنے گلے کی جھرّیاں کھڑے کالر

والی سلیولیس نائٹی سے چھپائی تھیں۔ جیسے میں ٹائی میں چھپاتا ہوں۔ اور بالوں کو اس طرح رنگتا ہوں کہ لگے کہ ابھی پکنے شروع ہوئے ہیں۔ اور شیو دو بار کرتا ہوں۔

میڈم نے اپنے سنہرے رنگ میں رنگے بالوں کو چمکدار بنا کر کسی کلپ سے جوڑے میں باندھ رکھا تھا۔ بھاری اور ڈھیلی ہوئی چھاتیوں کو اس طرح براہیں کس رکھا تھا کہ سچ مچ جوان لگتی تھی۔ اگر یہ اپنے جسم کی چربی ذرا کم کر لے تو ناواقف لوگوں کو دھوکہ دے سکتی ہے۔ ...میں نے چندر رکھی کی طرف تعریفی نظر سے دیکھا تو وہ میری نظر کی تاب نہ لا سکی تھی۔ بوکھلاہٹ اور خوشی میں بولی تھی۔ "تو لمبین داس۔ لگتا ہے کہ میجر نے مرغ مسلم کی پلیٹ آگے کر دی تھی۔"

چندر رکھی اور اس کے موڈ کو دیکھ کر میرا دل مچل گیا تھا۔ میں نے الماری میں سے بوتل، سوڈے کی بوتلیں، گلاس اور فرج میں سے آئس کیوب نکال کر میز پر سجا لیے تھے۔ جیسے وہ گھرا میرا ہو اور چندر رونشی میری مہمان ہو۔ سگریٹ کے دو کش لگا کر میں نے اسے پکڑا دیا تھا اور خود پیگ بنانے لگ گیا تھا۔

شراب پیتے ہوئے ہم اسی ٹیلی فلم کی باتیں کرنے لگے تھے جو میری روح سے چمٹی ہوئی ہے۔ جو اس کوٹھی میں فلمائی جاتی ہے جب کوئی بات ختم ہو جاتی تو میری نظر شاٹ لینے لگتی ...دیواروں پر کئی تصویریں ٹنگی ہیں، جو میڈم نے خریدی کم ہیں بیشتر دوست مصوّروں نے بطور تحفہ دی ہیں۔ ان میں دو پورٹریٹ میڈم کے اپنے ہیں۔ جو اس مصوّر دوست کے بنائے ہوئے ہیں جو اپنا سب کچھ بھول کر اس کے آنگن کا کتا بن کر بیٹھ گیا تھا۔ اسے جنون ہو گیا تھا میڈم کے پورٹریٹ اور اسکیچ بنانے کا۔ آخر کار اسے پاگل پن ہو گیا تھا۔ جب میڈم نے اسے پینٹنگ دینے سے انکار کر دیا تھا تو اس نے اپنے سارے برش توڑ ڈالے تھے۔ کلر ٹیوبین پھاڑ کر رنگ اپنے چہرے اور کپڑوں پر مل لیے تھے۔

سامنے والی الماری میں شیلڈیں سجی پڑی ہیں۔ جو میڈم کو بڑھیا فن کارہ ہونے کے ساتھ ساتھ بھرپور عورت ہونے کے سبب بھی ملی ہوئی ہیں۔ ساگوان کی لکڑی کے بنے سارے فرنیچر پر نقاشی کا بہت عمدہ کام کیا ہوا ہے۔ کمرے ہیں۔ جہاں کو نہ بنتا ہے۔ وہاں رکھی تپائی پر رکھے اصلی اور نقلی پھولوں کے گل دستے سجے ہوئے ہیں۔ کارنس پر کئی فوٹو گراف قیمتی فریموں

میں جڑے پڑے ہیں۔ ایک میجر کے ساتھ ہوئی شادی کے چند روز بعد کی ہے۔ جس میں میجر بہت سجیلا جوان لگتا ہے۔ اور چندر ونشی کمزور چھوکری سی۔ ایک حصّہ جنم دن یا نئے سال کی آمد کو مبارک کہنے والے کارڈوں سے بھرا پڑا ہے۔ ان کی ترتیب کچھ روز کے بعد بدل جاتی ہے۔

"یہ تمھیں فلم کی کیا بیماری لگ گئی ... ہر وقت کندھے پر کیمرہ رکھے گھومتا رہتا ہے..." اس کے بولنے سے پتہ چلا تھا کہ ہمارے گلاس خالی تھے۔ میں بھی خالی گلاس اپنے ہاتھ میں تھامے بیٹھا تھا۔ ایش ٹرے پر ٹنگا سگریٹ دھواں چھوڑ رہا تھا۔ "سوری" کہہ کر میں پیگ بنانے لگ گیا تھا۔ میڈم کی طرف دیکھ کر مجھے محسوس ہوا تھا کہ وہ بھی میری طرح سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جس کا چہرہ اداس دکھائی دیتا تھا۔ شاید کبیر والا واقعہ اندر ہی کہیں دھواں چھوڑ رہا تھا۔ میرے دیکھنے پر جب اس نے مسکراہٹ چھوڑی تھی تو مجھے محسوس ہوا تھا کہ رسوئی میں مُردہ گڑا ہوا ہے اور اوپر پکوان پک رہے ہیں۔

"تجھے یہ فلم نہیں بنانی چاہیے ... تو اچھی فلم نہیں بنا سکتا ... تم صرف اسکرپٹ لکھو" وہ ہاتھ میں گلاس پکڑ کر بولی۔ اس کے لہجہ میں تلخی صاف ظاہر ہوتی تھی

"وہ بڑھیا ہوگی یا گھٹیا، میں دعویٰ نہیں کرتا۔ البتہ الگ قسم کی ضرور ہوگی۔ جس میں بیک گراؤنڈ میوزک کلاسیکل ہوگا ... اپنے کرداروں کو جس باریک بینی سے میں نے دیکھا ہے۔ اور ... سمجھا ہے ... وہ زندگی میں جیا بھی ہوں۔

"کرشن یونہی بڑیں نہ ہانک ... کسی بھی کردار کو پوری طرح سمجھ لینا بہت مشکل ہوتا ہے۔ آدمی تو اپنے اندر پل پل بدل رہے آدمی کو نہیں سمجھ پاتا ... تو مجھے سمجھنے کا دعوے کر رہا ہے۔" وہ بحث کے موڈ میں بولی تھی۔

"دیکھو چندر مکھی۔ اپنے آپ کے بعد میں نے تجھے سب سے زیادہ سمجھا اور چاہا ہے۔" میں نے اس کی تلخی پگھلانے کے لیے کہا تھا "ایک عمر تک میں عشق وعشق کو فضول سی چیز سمجھتا رہا تھا ... مجھے جب بھی عورت کی ضرورت پڑی، میں نے اچھے یا برُے کسی بھی طریقہ سے حاصل کی تھی ... تجھے حاصل کرنے کے لیے بھی میں نے اس لیے کوشش تھی۔ لیکن ...

تیرے ساتھ کچھ عرصہ گزارنے کے بعد... اور عمر کے اس ڈھلتے حصّے میں احساس ہوا ہے کہ کسی ایک کو ہی پیار کرنے اور اس کا ہی ہو رہنے کا کتنا بڑا لطف ہے. سُکھ ہے. کتنی روحانی خوشی ملتی ہے. یہ سوچ کر کہ دنیا میں کوئی ہے. جس کو میں دل کے کالے کونے بھی دکھا سکتا ہوں... مگر تم اس آنند سے محروم ہو... جس نے پتہ نہیں کتنے لوگوں سے پیار کیا... جو ملا اُسی کی ہو کر رہ گئی. اگر کبھی کسی کے لیے پاگل سی ہوئی تو چند روز کے بعد اُسے ایسے دیکھا "تم کون ہو جی؟" آج چندر رکھی ہزار جتن کرنے پر بھی میں تیرے اس پہلو کو سمجھ نہیں سکا." یہ کہہ کر مجھے لگا تھا کہ میں بہت زیادہ بول گیا ہوں. نشہ سا چڑھنے لگا تھا... میرے تصوّر میں میڈم کی وہ تصویر اُبھرنے لگی تھی... چار ایک برس پہلے کی بات ہے.... موسم سرد تھا نہ گرم. شام کے وقت چندر رکھی ڈیک پر آرام کرسی پر بیٹھی تھی. ٹانگیں ریلنگ پر تھیں، کتاب پیٹ پر اور دونوں ہاتھ سر کے نیچے بندھے تھے. اسے میرے آنے کا پتہ تب چلا تھا جب میں نے بیٹھنے کے لیے کرسی گھسیٹی تھی. اس کا چہرہ دیکھ کر میں نے پوچھا تھا "سچ بتانا، روتی رہی ہو نا؟"

وہ مان گئی تھی. رونے کی وجہ اس نے بلا جھجک بتا دی تھی جیسے کہ میں اس کی سہیلی ہوں... وہ اس لیے روئی تھی کہ وہ ان دنوں جس دوست کو محبت نامے لکھتی رہی تھی اس نے اسے لکھ دیا تھا کہ آئندہ اسے خط نہ لکھا جائے. وہ اپنے گھر میں جھگڑا پیدا نہیں کرنا چاہتا... جب میں نے پوچھا تھا کہ چندر رکھی سچ بتانا کیا تو اسے اتنا پیار کرتی ہے؟ تو اس نے بتایا تھا کہ اس کے جے پور چلے جانے کے بعد اسے ایسا محسوس ہوا ہے.

تب میں نے چاہا تھا کہ ان دونوں کی ملاقات کسی نہ کسی طریقے سے کرا دوں... لیکن بعد میں میں اس بات سے جلتا رہا تھا کہ چندر ونشی اس شخص سے اتنی محبت کیوں کرتی ہے جو اس سے خط و کتابت کرنا نہیں چاہتا.

"تیرے اندر اتنی کتنی محبت ہے چندر رکھی جو اتنے دوستوں میں بانٹ گئی تو بھی ختم ہونے میں نہیں آتی؟... میرا دل تو تجھے اکیلی کو مل کر بھرتا نہیں."

چندر ونشی نے نیا سگریٹ سلگا کر میری طرف دیکھا تھا. مسکرائی تھی. بولی تھی "یہ بات تو کتنی

بار مجھ سے پوچھ چکا ہے۔ میں بار بار بتا چکی ہوں ... میرے تُو لمبن داس دیکھ۔ میں نے بہت دوستوں سے محبت کی ہے۔ جیسے ماں اپنے کئی بیٹوں کو کرتی ہے... پھر وہ کسی کی خوبیوں یا خرابیوں کے سبب گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔"

"بکواس بند کرو۔" میں نے تلخی سے کہا تھا۔ "یہ فضول دلیل ہے۔ بیٹے تو ماں کی تخلیق ہوتے ہیں۔ وہ ہمیشہ بیٹے کی محافظ ہوتی ہے۔ جبکہ تُو... نیا دوست ملنے پر پہلے دوست کے لیے بے رحم ہو جاتی ہے۔"

میری کڑوی بات سن کر اس پر مُردنی چھا گئی تھی۔ وہ میز پر کہنیاں ٹکا کر سگریٹ پینے لگی تھی۔ زور سے سانس لیتی تو گلے کی ایک موٹی رگ اُٹھتی بیٹھتی دکھائی دیتی تھی... میرا کیمرہ اس کے کلوز اَپ لے رہا تھا۔ اس کی ٹھڈّی کے نیچے گوشت کی پوٹلی سی لٹک آئی تھی۔ بغلوں کا گوشت اُبھر کر پوٹلیاں بن کر باہر نکل رہا تھا۔ جن پر کچھ روز پہلے مُنڈے بالوں کے سرے دکھائی دیتے تھے۔ آنکھوں کے نیچے گڑھے اور اُبھار تھے۔ ہاتھوں کے اوپر کی کھال ہاتھی کے سونڈ کی طرح سُکڑا ہوا چمڑا بنا ہوا لگا۔ تمام جھرّیاں اس طرح نمایاں تھیں جیسے ٹیسٹ ٹیوب میں بیج میں سے نکل رہے ریشے دوربین سے دکھائی دیتے ہیں... میں نے سوچا تھا۔ اس کے یہی اَبرو کبھی تیر کمان تھے، جن کو دیکھ کر جوان زخمی ہو جاتے تھے، جن کا ذکر میں نے ہر اُس ناٹک میں کیا تھا جس میں چندر رونشی ہیروئین کا رول ادا کرتی تھی... اب تو ایسا لگتا ہے جیسے ابرؤں کو بال خورہ لگا ہے۔

تبھی دروازہ پر کسی نے دستک دی۔ "آجاؤ" کہنے پر سُورم سنگھ اندر آیا تھا۔ اس نے تلی مچھلی کی پلیٹ میز پر رکھ کر کہا تھا "میجر صاحب نے بھیجی ہے۔"

"آج میجر ہم دونوں پر مہربان ہے چندر تکھی۔" سورم سنگھ کے چلے جانے پر میں نے کہا تھا۔ مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ سیب کا ٹکڑا لیے بیٹھی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے وہ ٹکڑا لے کر رکھ دیا تھا۔ اور اس کے منہ میں مچھلی کا ٹکڑا ڈالنے لگا تھا... جب اس منہ نہیں کھولا تھا تو مجھے محسوس ہوا تھا کہ وہ اب بھی رنجیدہ ہے۔ میں نے اس کا موڈ بدلنے کے لیے پوچھا تھا "اچھا یہ بتا کہ کوئی شخص تجھے کیسے اچھا لگنے لگتا ہے، جبکہ دوسرے نظروں

سے گر جاتے ہیں۔"

"پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے... کوئی شخص ملتے ہی ایسا لگنے لگتا ہے۔" اس نے مجھے سگریٹ پکڑاتے ہوئے بتایا تھا۔ "کئی بار مجھے خود حیرانی ہوتی ہے کہ ایسا کیوں ہوا... ضروری نہیں کہ وہ شخص خوبصورت ہی ہو... اس کی کوئی بات، کوئی حرکت مجھے متاثر کر جاتی ہے... تو بھی پتہ نہیں مجھے کیوں اچھا لگنے لگا تھا؟"

"میں بتاؤں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ میں نے سگریٹ کا آخری کش لے کر کہا تھا "تجھے کسی سولہ کلا سمپورن آدمی کی تلاش ہے۔ یہ تلاش تب سے شروع ہوئی تھی جب تمہارے ڈیڈی سورگ سدھارے تھے۔ تو کالج میں پڑھتی تھی... تجھے جو بھی شخص ملا، میجر، میں، پاگل مصور یا اور کوئی۔ وہ تجھے پہلی نظر میں سولہ کلا سمپورن ہی دکھائی دیا تھا۔ اور پھر وقت گزرنے پہ دس کلا بھی نہیں رہے تیری نظر میں... کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ اگر کبھی سچ مچ کوئی بیس کلا سمپورن مل گیا تو بھی پیار کی بھوکی تیری روح بھرے گی نہیں۔ ترستی ہی رہے گی۔"

"تمھیں نہیں تلاش ایسی عورت کی؟" اس نے جواب دیتے ہوئے سوال پوچھا تھا۔

"نہیں... میں بذات خود بہت ادھورا اور ٹوٹا پھوٹا ہوں... مجھے ہر نفس میں ایسی ہی ٹوٹ پھوٹ دکھائی دیتی ہے۔ میرے لیے یہی اصلی زندگی کا جوہر ہے۔ تو بھی یہی کچھ ہے... میجر شیر گل اور کبیر بھی... میں تجھے ملا تھا تو میری نیت خراب تھی۔ پھر تیرا یوں ٹوٹا پھوٹا سا وجود مجھے اپنے جیسا لگا تھا... پھر دھیرے دھیرے مجھے محسوس ہونے لگ گیا تھا کہ تیری جکڑ میں رہنا میری مجبوری ہے... وہی مجبوری مجھے لکھنے کے لیے اُکساتی ہے... چلو چھوڑو... یہ باتیں پہلے بھی ہم کئی بار کر چکے ہیں۔"

"تو کیا ہوا... تم کرتے رہو... مجھے اچھی لگتی ہیں۔" بولتی ہوئی چندر لکھی کی آنکھیں تر ہونے لگی تھیں۔ چہرہ لال ہو گیا تھا۔ گھمنڈی ناک اور اونچی ہو گئی تھی... اس نے اپنے بال کھول کر کندھوں پر پھیلا لیے تھے۔ پھر پوچھا تھا " اچھا۔ بتا مجھ میں کیا چیز ہے جو تمھیں باندھے ہوئے ہے؟"

دل کرتا تھا کہ کہہ دوں کہ وہ تیرے ناک کے کوکے کے نگینے کی چمک ہے۔ پھر سوچا

کہیں غصّہ نہ ہو جائے اس مذاق پر۔ اپنی بات کو بدل کر دل کا ڈائمنڈ کہنے لگا تھا کہ اندر سے سچّائی پسند بیدار ہو گیا۔ اور میری زبان سے نکل گیا تھا " وہ میری کوئی اور مجبوری ہے، تم نہیں ... سچ بتاؤں؟... مجھے لگتا ہے کہ ہر ایک مَرد کے اندر کئی دوسرے مرد چھپے بیٹھے ہوتے ہیں۔ میرے اور تیرے اندر بھی ... وہ الگ الگ پلوں میں الگ الگ رول ادا کرتے ہیں ... میرے اندر ایک شخص ہے جو محبت، نفرت، حسد اور مرد کی ضرورتوں سے بالا ہو کر تجھے چاہتا ہے ... مجھے اور بھی کئی عورتیں ملتی ہیں۔ اچھی لگتی ہیں۔ لیکن میرے اندر کا وہ ایک شخص ان سب کو رد کر دیتا ہے۔"

"تیرے دل میں کبھی یہ خواہش پیدا نہیں ہوئی کہ کوئی بہت جوان عورت ملے۔ جو سب کچھ تجھ پر نچھاور کر دے؟" چندر ونشی نے پرکھتی سی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا لیکن میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میں میز کے نیچے اپنا پیر ننگا کر کے اس کے پیروں کے اوپر کے حصّے پر آہستہ آہستہ لگانے لگا تھا۔ اور اس سے یہی سوال پوچھا تھا جس سے اس کے چہرے پر مُردنی سی چھا گئی تھی۔ آنکھوں میں اداسی بھر گئی تھی۔ مجھے تب احساس ہوا تھا کہ ایسا سوال مجھے آج نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں نے بات بدلنے کے لیے کہا تھا " آج میجر پھر وہی شعر پڑھ رہا تھا۔" دل میں آتا ہے لگا دوں آگ کوہِ طُور کو ... پھر خیال آتا ہے، موسیٰ بے وطن ہو جائے گا ... پھر وہ پھیکتی سی آواز پیدا کر کے ہنسا تھا۔ میں یہ سوچتا رہا تھا کہ آج وہ 'موسیٰ' کسے کہہ رہا تھا؟ ... مجھے؟ تجھے؟ یا اپنے آپ کو؟"

"خاموش ... یہ آواز سن؟ ... کاہے کی ہے؟ ... پٹاخہ چلا ہے۔ دھماکہ ہوا ہے ... یا گولی چلی ہے کہیں؟" میں نے خوفزدہ ہو کر پوچھا تھا۔

"یہ تو یونہی ہے۔ بس یونہی ... اس گلی کے آخر میں ایک کیپٹن کی کوٹھی ہے۔ شراب پیتے ہوئے اسے وہم ہو جاتا ہے کہ انتہا پسند آ گئے ہیں۔ وہ چھت پر چڑھ کر فائر کرنے لگ جاتا ہے۔"

"نہیں یہ تو سچ مچ گولیوں کی آواز لگتی ہے۔"

"ہونے دو ... لیکن یہ میجر کون ہوتا ہے گھر کو آگ لگانے کی بات سوچنے والا؟ وہ ایک دم تلخ ہو گئی تھی۔ لگتا تھا کہ چندر ونشی کو میجر کی بات کاٹ گئی ہے۔ ہاتھ میں پکڑا مچھلی

کا ٹکڑا اس نے واپس پلیٹ میں رکھ دیا تھا۔ مجھے بھی نشہ سا ہو گیا تھا۔ لگتا تھا کہ مزید پینے کی طاقت نہیں رہی۔ میں میز پر کہنیاں ٹکا کر اور چہرہ ہاتھوں میں تھام کر بیٹھ گیا تھا آنکھیں بند کر لی تھیں۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" اچانک اس نے کرسی سے اُٹھ کر اپنا وزن میرے کندھوں پر ڈال کر میرے گالوں کے نزدیک منہ لے جا کر پوچھا تھا۔ "گولمپن داس۔ ایک ایک پیگ اور ہو جائے؟"

میں نے 'ہاں' نہیں کہا تھا۔ اس نے ایک نظر بھر کر دیکھا تھا۔ وہ دو ہلکے ہلکے پیگ بنا لائی تھی۔

"تم اپنی فلم کے بارے میں نہیں سوچ رہے؟" اس نے پوچھا تھا۔

"ہاں۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس فلم کو المیہ بنایا جائے۔ جس سے یہ احساس پیدا ہو کہ یہ کوٹھی یا کلا بھون' جو ساری کائنات کی علامت ہے۔ میں بسنے والے اور اس میں آنے جانے والے لوگ بوڑھے ہو رہے ہیں۔ اُکتا گئے ہیں اس جھوٹی، نقلی، بے رحم، دغا باز زندگی سے ... وہ سیاسی لیڈروں کے جال میں پھنسی مکھی کی طرح محسوس کر رہے ہیں۔ چاروں طرف خون بکھر رہا ہے۔ زندگی لاچار ہو گئی ہے۔ کسی کا کسی پر اعتماد نہیں رہا۔ ... اب وہ موت کے انتظار میں ہیں ... چاروں طرف سوگوار دھنوں کے درمیان ارتھیاں اُٹھ رہی ہیں۔ کوٹھی کی دیواریں، چار دیواری، بیل بوٹے، ہر چیز پر پت جھڑ کا سا سماں ہے۔ پھول پتے اور دیواریں اپنے رنگ گنوا رہے ہیں۔ ہر شے اپنے ماتمی انجام کی طرف بڑھ رہی ہے۔"

"نہیں۔ یہ ٹھیک نہیں ... تو ناظرین کو بے حد مایوس کر دے گا۔ جیسے تیری اپنی زندگی ہے ... جڑوں سے کٹی ہوئی۔" میڈم سوچتے ہوئے پھر بولی تھی "میں چاہتی ہوں کہ اس تباہی سے بھی امید کی کوئی کرن پھوٹے۔ باہر نکلے۔ خواہ وہ ہلکی سی ہو۔ ٹوٹوں کی کونپلیں پھوٹیں۔ جو سی کی جگہ کوئی ایلیشن آئے۔ چھت پر، اس ڈیک پر شبنم کھڑی ہو ... اور ... اور ..."

"اکیلی؟"

"نہیں۔ اس کے ساتھ کوئی بھی ہو ... انجام اتنا واضح نہ سہی، کوئی پرچھائیں سی ہو سکتی ہے۔" اس کی بات ختم ہونے پر ہم خاموش ہو گئے تھے۔ اپنا اپنا گلاس اُٹھا کر سِپ کر رہے تھے۔

"کبیر کے بارے میں تیرا کیا خیال ہے؟" اس نے اچانک پوچھا تھا۔ مجھے وہ واقعہ اچانک پھر یاد آ گیا تھا۔ میں نے سوچ کر جواب دیا تھا "بس ٹھیک ہے۔ اچھا، سمجھدار نوجوان ہے... ذرا جذباتی ہے۔ سنی سنزم بھی لیے پھرتا ہے۔ وہ بھی تب سے جب ٹی۔وی میں ملازم ہوا ہے... کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ اس کے بارے میں قطعی طور پر کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ پتہ نہیں چلتا کہ وہ اگلے پل کیا کرے گا... ویسے تو یہ بات ہر شخص پر لاگو ہوتی ہے۔ لیکن وہ تو پہلے کچھ ظاہر ہونے ہی نہیں دیتا۔ تیری اور میری طرح اپنے دل و دماغ اور جسم پر قابو نہیں رکھ سکتا..."

بات کرتے ہوئے مجھے شراب کے نشہ میں لال ہو رہا میڈم کا چہرہ لُبھانے لگا تھا۔ چہرے کے اِرد گرد نور سا بکھرا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ چمکتے ہوئے چہرے پر بھی ناک کی تیلی کا ڈائمنڈ ہر پہلو سے دمک رہا تھا... میں حیران تھا کہ وہ روپ کہاں سے آ گیا تھا؟... میں اپنا پیگ ہاتھ میں تھام کر کھڑا ہو گیا تھا۔ آگے بڑھ کر میڈم کو بائیں بغل میں دبا کر ماتھا چوم لیا تھا۔ اپنا بایاں گال اس کے سر پہ رکھ دیا تھا... پھر پیچھے ہٹ کر دیکھا۔ اس کی شرابی نظر احسان مندی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ پیار سے آنکھیں بھر آئی تھیں... میں چاہتا تھا کہ بات یہیں پر ختم کر دی جائے۔ خوشگوار انجام پر۔ اب کھانا کھا لیا جائے۔ میں نے سوماں کو آواز دے دی تھی کہ کھانا گرم کر دیا جائے۔

مگر چندر مکھی کا موڈ ابھی بات ختم کر دینے کا نہیں تھا۔ اس نے دو دو گھونٹ شراب گلاسوں میں ڈال لی تھی۔ "بس آخری" کہہ کر اس نے گلاس میرے آگے سرکا دیا۔ اور سوماں کو آواز دے دی تھی کہ وہ آدھ گھنٹہ کے لیے رُک جائے۔

میز پہ بازو رکھ کر اور پہ چہرہ ٹکا کر وہ میری طرف لگاتار دیکھے جا رہی تھی۔ مجھے لگا تھا کہ آج اِسے پیار کی زیادہ ضرورت ہے۔ جس میں اپنوں جیسی سچّی ہمدردی ہو۔ میرے اتنا سا چھو دینے نے اُسے جذباتی بنا دیا تھا۔

کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ پھر پتہ نہیں کیسے میری بدبخت زبان سے نکل گیا تھا۔
"چلو چھوڑو کبیر کو اور آج کے واقعہ کو... آؤ پیار کریں!"

اس نے بہت حیرانی سے میری طرف دیکھا تھا۔ دیکھتے دیکھتے اس کے ہونٹ کانپنے لگے تھے۔

ماتھے پر پسینہ آگیا تھا۔ آنکھیں تن گئی تھیں ... میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اسے کیا ہو رہا تھا؟ ... تبھی اس کے ہونٹ بھنچ گئے تھے۔ اس نے اپنا چہرہ بازو سے چھپا لیا تھا۔ وہ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔ میں نے اُٹھ کر اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ چہرہ اوپر اُٹھا کر رومال سے آنسو پونچھ ڈالے تھے۔ اسے کُرسی سے اُٹھا کر باہوں میں بھر کر بہت پیار سے چوما تھا۔

لیکن اس نے اچانک اپنا آدھا جسم میری گرفت سے چھڑا کر دُور کر لیا تھا۔ آگ برساتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا تھا۔ شراب والا گلاس اُٹھا کر فرش پر دے مارا تھا۔ تڑپتی سی بولی تھی "میں جان گئی ہوں ... تم سب مطلبی ... کمینے ہو ... میرا پیسہ، میرا جسم، میری آتما کو کھانے والے ... احسان فراموش ... کوئی سالا میری شبنم کے بارے میں نہیں سوچتا ... میری اس معصوم بچّی کا کیا بنے گا؟"

بولتے ہوئے اس نے میری طرف تھوک کر وہ لَوندا سا پھینک دیا تھا جو اس کے بوڑھے مسوڑھوں کے ارد گرد شراب نے پیدا کر دیا تھا۔ میں کھڑا اس کی گالیاں سنتا رہا تھا ... پھر پتہ نہیں اسے کیا ہوا تھا کہ بھاگ کر مجھ سے لپٹ گئی تھی اور زار و قطار روتی رہی تھی۔

میں حیران سوچ رہا تھا کہ یہ دُکھ جو رویا جا رہا ہے، میرا ہے؟ شبنم کا ہے یا کبیر کا؟

گھوڑا

میری موسی کا بیٹا ماسٹر رمیش بوڑھا نہیں تھا مگر پرہیزی کھانا کھاتا تھا۔ شراب پینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شادی میں فرض نبھانے آیا تھا۔ اتفاق سے برسوں بعد ملا تھا۔

میں پیٹ بھر کر رات کا کھانا کھانے کے بعد جب سگریٹ سلگانے لگا تو اُس نے مجھے ایک طرف لے جا کر کہا "چھوڑو بھی ان چھوکروں کو۔ میں نے کسی رشتہ دار کے ہاں کمرے کا بندوبست کر رکھا ہے۔ بستر لگوا لیے ہیں۔ لیٹ کر گپیں ہانکیں گے۔" میں اس کے ساتھ چل دیا۔

رشتہ داروں کی باتوں سے اُکتانے کے بعد اس نے مجھے اپنی پریم کہانی سنائی۔ اور پھر اُسے صحیح اور موثر ثابت کرنے کے لیے ایک افسانہ نگار کی لکھی کہانیاں سناتا رہا، جن میں آدمی کسی بھی عمر میں کسی بیگانی عورت سے دوستی کر کے خود کو مالا مال ہوا محسوس کرتا ہے۔ ہر ایک کہانی اس بات پر ختم ہوتی کہ اس عورت کے پیار نے اُسے ہاتھ بھر اونچا کر دیا۔ اس کی ساری شخصیت ہی بدل گئی۔ وہ بڑھیا انسان بن گیا۔ جینا صرف اس کے لیے ہی نہیں بلکہ اس کے تمام رشتہ داروں اور گھر کے لوگوں کے لیے بھی آسان ہو گیا۔

رمیش نے اپنی کہانی کا نتیجہ بھی یہی نکالا کہ محبت کے وہ دو برس اس کی زندگی کے ویران ریگستان میں نخلستان کی طرح تھے۔ جن کو یاد کر کے اب بھی وہ ٹھنڈی چھاؤں اور خوشگوار ہوا کے جھونکے محسوس کرتا ہے۔

میں نے اُکتا کر اُسے روک دیا۔ کہا "مجھے لگتا ہے کہ وہ افسانہ نگار رومانیت پسند ہے۔ وہ مثالی کردار پیش کرتا ہے۔ اور تیرا تجربہ ایک پہلو کا ہے ... عورت کی محبت صرف سُکھ اور لطف

ہی نہیں دیتی، دُکھ اور اذیت بھی پیدا کرتی ہے۔ وہ آدمی کو بے عزت اور ذلیل بھی کرتی ہے۔ اس سے جلیبے مالنس کی بو آتی ہے۔"

میری بات سن کر وہ تکیے پر کھڑے اپنے بازو والے ہاتھ پر سر رکھ کر میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے سگریٹ سلگا کر اپنی بات منوانے کے لیے اسے اپنے دوست کی بات سُنائی۔

— کلدیپ مہتا کالج میں میرے ساتھ پڑھتا تھا۔ ہم بھی کام کر کے اسی برس کپڑے کی فرم میں ملازم ہوئے تھے۔ اب وہ دفتر میں ہیڈ اکاؤنٹینٹ ہے اور میں کہنے کو تو ڈپٹی منیجر ہوں مگر میرا کام زیادہ تر باہر جانے کا ہی رہتا ہے۔ کبھی بگڑی ہوئی پارٹی سیدھی کرنے، کبھی ڈوبی ہوئی رقم وصول کرنے اور کبھی فرار ہوئی اسامی کو ڈھونڈنے کے لیے۔ دفتر میں مہتا کی بہت چلتی ہے۔ پچیس تیس ملازم اس کے ماتحت کام کرتے ہیں۔ اپنے کام میں ماہر ہونے کے سبب مالک بھی اس کو خوش رکھتے ہیں۔ دفتر میں اسی لیے اس کا دبدبہ ہے۔ لیکن میں اسے دفتر میں بھی 'مہتا' کہہ کر پکارتا ہوں۔

چالیس برس کے ہونے کے باوجود ہم جب کہیں باہر ملتے ہیں تو 'اوئے کمینے' کہہ لیتے ہیں۔ اور چائے خانہ میں بیٹھ کر تمام چھوٹی موٹی گندی مندی باتیں کر لیتے ہیں۔

چھ ایک ماہ کی بات ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ مہتا جب میرے گھر آتا ہے تو اس کا چہرہ قدرے تنا ہوا ہوتا ہے۔ جاتا ہے تو بھی بجھا بجھا سا۔ باتیں کرتے وقت اس کی توجہ کہیں اور ہوتی ہے۔ کئی بار وہ میری بات پکڑ ہی نہیں پاتا۔ اور کبھی کسی کے بارے میں بنائی ہوئی بات کسی اور سے وابستہ کر لیتا ہے۔ دفتر میں بھی کسی چھوٹی سی بات پر بھڑک اٹھتا ہے۔ کسی کا لہجہ اسے ذرا سا کرخت محسوس ہوا نہیں، اس نے کاغذات فرش پر پٹکے نہیں۔

میں سمجھا کہ یہ ڈھلتی عمر کی نشانی ہے۔ گھر کی ذمہ داریوں کے بوجھ کے سبب ہے۔ ایک روز منیجر نے مجھے بُلا کر اس کے گھر کے حالات پوچھے۔ میں کیا بتاتا؟ بھابی سے اس کی لڑائی کی بات کبھی سنی ہی نہیں تھی۔ ایک دن بھابھی نے شکایت کی تھی کہ وہ کم بولتا ہے، ہنستا نہیں ہے۔ اکثر گھر سے باہر گھومتا رہتا ہے۔

جب میں نے اس سے پوچھا تو کہنے لگا "یونہی یار۔ بلڈ پریشر کچھ ٹھیک نہیں رہتا۔ کبھی لو

ہو جاتا ہے، اور کبھی ہائی۔ چیک اپ کرایا ہے۔ دوائی کھا رہا ہوں۔"

ایک دن مجھے اس کے بلڈ پریشر کے لو اور ہائی ہونے کا سبب معلوم ہو گیا... وہ تھا میرے بہاری کرائے دار سکینہ کی بیوی آشا... یونہی معمولی شکل صورت والی، رنگ سانولا، چوڑا ماتھا، موٹے ہونٹ اور درمیانے قد والی عورت۔ اس کا جسم تو اکہرا تھا مگر اگلا اور پچھلا حصّہ بھاری تھا۔ وہ بہت میٹھا بولنے والی، شرمانے والی شریف عورت تھی۔ وہ میک اپ نہیں کرتی تھی۔ ناک میں تیلی ڈالتی تھی اور کانوں میں سادہ سے ٹاپس۔ وہ بازاروں میں بِلا کام نہیں گھومتی تھی، اور نہ ہی کوئی نامحرم شخص اس کے پاس آتا تھا۔ سارا دن اپنے ڈھائی تین سال کے بیٹے کے ساتھ کھیلتی رہتی تھی۔ یا سلائی کڑھائی کا کام کرتی رہتی تھی۔
وہ ٹوٹی پھوٹی بیکار چیزوں کو جوڑ کر بڑے شاندار سجاوٹی نمونے تیار کر لیتی تھی۔ سکینہ دواؤں کی کمپنی میں ایجنٹ تھا۔ وہ گھر پر کم ہی رہتا تھا۔ اس کے کنبہ کی دیکھ بھال ہم ہی کرتے تھے۔ مکان کا کرائے والا حصّہ ایک طرف تھا۔ میں نے ان کی سہولت کے لیے ایک چھوٹا گیٹ لگوا دیا تھا۔ سکینہ رات کو کبھی دیر سے آتا اور کبھی بہت سویرے آجاتا تھا۔ مکان کے دونوں حصّوں کے درمیان چھوٹی سی دیوار تھی۔ جسے بچّے بھی پھاند سکتے ہیں۔

ایک ماہ پہلے کی بات ہے۔ میں نے دیکھا کہ کوئی شخص سکینہ کے گیٹ سے نکل کر تیزی کے ساتھ ہسپتال والی گلی میں گھُس گیا۔ ابھی رات کے آٹھ ہی بجے تھے۔ میں نے اس کا پیچھا کیا۔ وہ ٹی اسٹال والے موڑ سے بڑی سڑک کی طرف ہو لیا۔ میں نے 'بھائی صاحب' کہہ کر آواز دی تو وہ تیز ہو گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اُسے روک لیا... میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ مہتا تھا۔ میں نے کہا" اوئے کمینے چوروں کی طرح لوٹ چلا تھا۔ چل گھر کو..." لیکن وہ یہی کہتا رہا۔ آج جانے دے موڈ ٹھیک نہیں ہے۔

میں اس کے ساتھ ہی چل دیا۔ وہ اپنے گھر کی طرف نہیں گیا۔ ریلوے روڈ کی طرف چل دیا۔ چلتے ہوئے میں نے پوچھا کہ بات کیا ہے۔ کہنے لگا کہ بتانے والی نہیں ہے۔ میں حیران تھا کہ ایسی بات کیا ہو سکتی ہے؟ وہ تو مجھ سے اپنی جنسی کمزوریاں اور کمینگیاں بھی نہیں چھپاتا۔ جب بھی کوئی واقعہ درپیش ہوتا ہے تو جھٹ مجھے بتا دیتا ہے۔

میں بیسمینٹ والی بار میں لے گیا۔ بیئر آ گئی۔ پینے لگا تو وہ مسکرا دیا۔ میں نے سوچا کہ لو اب پکڑا گیا۔ یہ اس کی عادت ہے۔ جب میری طرف دیکھ کر مسکراتا ہے تو وہ اپنے دل کی بات بتانے کے لیے خود کو تیار کر رہا ہوتا ہے۔ بالآخر وہ بتانے ہی لگا۔ کہنے لگا۔ یار میں پھنس گیا تھا، مگر اب کوئی بات نہیں ہے۔ میں اس دلدل میں سے نکل آیا ہوں... تو ذرا سوچ۔ اپنی کوئی عمر ہے پھنسنے کی؟... اور پھر وہ سالی چھوکری سی۔ پتہ نہیں اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے؟"

میں نے کہا" کمینے، تو نے پھنسنے والی بات تو بتائی ہی نہیں۔ اب نکلنے والی بتانے لگا ہے۔ شروع سے بتا۔ کہنے لگا" شروع اور بیچ کی بتانا تو مجھے آتا نہیں۔ جو بات ہوئی وہ سن لے ... لیکن کسی کے پاس بات نہ کرنا۔ مذاق یا اشارہ بھی نہ کرنا۔ میم کے سامنے۔"

وہ اپنی گوری چٹی بیوی کو میم کہہ کر پکارتا ہے۔ میں نے بیئر کا گلاس اوپر اٹھا کر قسم لی۔ ایک اور کا آرڈر دیا۔ مہتا جھجکتا سا بات سنانے لگا" تجھے یاد ہو گا ایک بار تیرے گھر میں ہم چائے پی رہے تھے۔ میں نے آشا کے بنائے اس بیگ کی تعریف کی تھی جس پر سیپیوں اور رنگا رنگ موتیوں سے ایک تصویر بنائی ہوئی تھی۔ جس میں کھجور کے درخت کے نیچے مٹی کے ڈھیر پر بیٹھا ماہی گیر بنسی بجا رہا تھا... جب وہ اٹھ کر جانے لگی تو ایک بار پھر تعریف کر دی۔ بعد میں میں سوچتا رہا کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟ مجھ میں یہ بے باکی کہاں سے آ گئی؟... وہ بیگ مجھے اتنا خوبصورت نہیں لگا تھا۔ رات کو میں سوچتا رہا کہ وہ مجھے اتنی خوبصورت کس پہلو سے لگی تھی؟... سوچ سوچ کر مجھے محسوس ہوا تھا کہ اس کے سانولے چہرے پر موٹے ہونٹ اور آنکھوں پر لال ڈورے اچھے لگتے ہیں... بات آئی گئی ہو گئی۔ جب کبھی وہ میرے سامنے ہوتی، مجھے کچھ نہ ہوتا۔ جب وہ چلی جاتی مجھے اس کے ہونٹ اور آنکھیں یاد آتیں... ایک رات میم صاحبہ کے ساتھ لیٹے ہوئے مجھے خیال آیا کہ اگر اس گوری اور خوبصورت عورت کا رنگ سانولا ہوتا، ہونٹ موٹے ہوتے اور آنکھیں مسکین سی ہوتیں... مسکین نہیں... جیسے کچھ تلاش کر رہی ہوں۔ جن کی سفیدی میں لال لال ڈورے ہوں۔ جو پہلی بار دیکھنے پر عام سی لگتی ہوں۔ مگر آہستہ آہستہ آدمی کے اندر پھیلتی چلی جائیں۔ اور پھر آدمی کو جکڑ لیں۔

"ایک روز میم گئی ہوئی تھی۔ فرصت سے اکتایا ہوا میں اس کے گھر چلا گیا۔ وہ بہت خوش

ہم چائے پیتے رہے ۔ وہ کبھی کوئی پھل کاٹ کر میرے آگے رکھتی اور کبھی کوئی نمکین چیز ۔ پھر مجھے اپنے سجاوٹی نمونے نکال نکال کر دکھاتی رہی ۔ میں تعریف کرتا رہا ۔ اس دن مجھے اس کے ہونٹوں اور آنکھوں کی خوبصورتی کا احساس تیزی سے ہوا ۔ میں جلدی گھبرا گیا ۔ اور تیزی سے اٹھ کر تیرے گھر چلا گیا ۔

"اس روز شام کو وہ تمہارے گھر ملی تو اس کا بچّہ مجھے بہت پیارا لگا ۔ میں اس سے لاڈ کرتا رہا ... ایک بار تمہارے گھر کے سب لوگ کہیں گئے ہوئے تھے ۔ اس نے مجھے خود دعوت دی تھی ۔ مجھے بازار میں ملی تھی ۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ آج کل میں اکیلی ہوں ۔

"میں دفتر سے آیا تو وہ برآمدے میں کھڑی تھی ۔ مجھے لگا ، وہ میرا انتظار کر رہی ہے ۔ اس نے لال پیلے رنگ کی راجستھانی ساڑھی پہنی ہوئی تھی ۔ مگر پہننے کا انداز ایسا تھا کہ بدن کی صحت کا پورا احساس ہو ۔ ہم نے چائے کا ایک ایک پیالا لیا ۔ بچّہ کھیلتا رہا ۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں اس کے پاس اب رک نہ سکوں گا ۔ مجھے چلا جانا چاہیے ۔ دل گھبرانے لگا میں اٹھ کر چلنے لگا تو اس نے روکتے ہوئے کہا ' کہاں چل دیئے ؟ ... میں کھانا تیار کرنے لگی ہوں ، اب کھا کر ہی جانا ' ... لیکن میں ' ابھی آیا ' کہہ کر باہر نکل گیا ۔ دل کرے تجھے مل کر دل کا حال کہوں ۔ مگر ڈر گیا ۔ کہیں بات کا بتنگڑ نہ بن جائے ۔

"سڑکوں پر آوارہ گھومتا گھامتا رات کے نو بجے اس کے گھر پہنچ گیا ۔ وہ کھانا تیار کر کے بیٹھی تھی ۔ ہلکی ہلکی سردی تھی ۔ تو بھی اس نے نہا دھو کر گاؤن پہنا ہوا تھا ۔ بال سلیقے سے سنوار کر جوڑا کیا ہوا تھا ۔ ہلکی سی لپ اسٹک لگا رکھی تھی ۔ اس کے نزدیک ہونے پر پتہ چلا کہ اس نے کوئی عطر بھی لگا رکھا تھا ۔ شاید بدن کی بدبو ختم کرنے کے لیے ، جو مجھے بھلی لگتی تھی ۔ دو بار میں اس بُو کو محسوس کرنے کے لیے اس کے نزدیک گیا تھا ۔ دل چاہتا تھا کہ اس کے بُو والے کسی حصّے کو کھرچ کر رومال میں رکھ لوں ۔

"کھانا بہت لذیذ تھا ۔ اس لیے میری پسند کے حساب سے بھری بھنڈی ، مچھلی اور کدّو کا رائتہ بنایا تھا ... باتیں کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ اس کا خاوند پونے گیا ہوا ہے ۔ چھٹی آئی ہے ... پرسوں آئے گا ... بچّہ دودھ نہ پینے کی ضد کرتا ہوا رونے لگا ۔ اس نے اسے اندر

لے جا کر سلا دیا... ہم کافی پیتے ہوئے باتیں کرتے رہے۔ مجھے عورتوں سے باتیں کرنے کا سلیقہ نہیں آتا۔ مجھے پتہ ہی نہیں کہ عورت کی کسی بات کا جواب کون سا ہو۔ جس سے وہ خوش ہو جائے۔ لہٰذا میں آشا کے گھر بار کی باتیں پوچھتا رہا۔ اس کی ماں بنگالی تھی اور باپ بہاری۔ اسے پنجابی لوگ اچھے لگتے تھے مگر ان کے سوبھاؤ کی کرختگی پریشان کرتی تھی... اس نے مجھ سے کچھ نہ پوچھا۔ جیسے میرے بارے میں سب کچھ جانتی ہو۔ یا اُسے جاننے کی ضرورت ہی نہ ہو۔ اس کے ڈرائنگ روم کی کھڑکیوں اور دروازوں پر لٹکتے پردے کھلتے ہوئے رنگوں اور ڈیزائنوں کے تھے۔ رنگوں کا انتخاب اس پر ختم تھا۔ میں تو اس کے سامنے اُلّو تھا۔ سجاوٹ کی تعریف کرتے ہوئے میری نظر دیوار پر ٹنگے ایک سجاوٹی نمونے پر پڑی۔ اس پر تصویر کشی کا کام رنگا رنگ کترنوں کو جوڑ کر کیا گیا تھا۔ تین جیبیں لگی تھیں۔ جن میں کاغذ پتر ڈالے جا سکتے تھے۔ میں اس کی تعریف کرتا ہوا اس کے نزدیک چلا گیا۔ "ٹھہریئے۔ میں اُتار کر دکھاتی ہوں، کہہ کر وہ اسٹول نیچے رکھ کر اُسے اُتارنے لگی تو پھسل کر لڑھک گئی۔ اور بیٹھ کے بل فرش پر گر پڑی۔ اس کی ایک ٹانگ پوری اور دوسری آدھی ننگی ہو گئی۔ اس کے دکھائی دینے والے سانولے رنگ اور اکہرے بدن کے برعکس کپڑے میں لپٹے رنگ گورے اور بھرے بھرے تھے۔ میں نے جلدی سے بازو پکڑ کر اُسے اُٹھایا۔ وہ میری طرف دیکھتی ہوئی اپنے گرنے پر خوب ہنسی۔ پھر سر جھکا کر سوچتی رہی۔ اس کی بانہہ اُسی طرح میرے ہاتھ میں تھی... زندگی میں پہلی بار میں نے کسی غیر عورت کا بازو اس طرح تھاما تھا۔ اُس روز پتہ نہیں مجھ میں جراُت کہاں سے پیدا ہو گئی تھی۔ میں نے اپنی دوسری بانہہ اس کے کندھے پر رکھ دی۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے روشنی گل کرنے کے لیے سوئچ کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس نے سر نفی میں ہلا دیا۔ ڈرتا ہوا میرا ہاتھ پیچھے ہٹ گیا۔ میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا.... میں کافی بناتی ہوں۔ یہ کہہ کر وہ اندر چلی گئی۔ ٹرے لے کر باہر آئی تو پوری بنگالن لگتی تھی۔ اس نے اپنے بال کندھوں پر بکھیرے ہوئے تھے۔ اس کی ہر حرکت کی کشش بے بہا ہو گئی تھی۔ مجھے لگا کہ اس نے یہ روپ مجھے تنگ کرنے کے لیے بنایا ہے۔ کافی پی کر مجھے کوئی بات نہیں سوجھ رہی تھی۔ وہ بھی خاموش رہی۔ وہ اُٹھ کر اندر کے کمرے میں گئی تو میں اس کے پیچھے چلا گیا۔ اس نے میرا ہاتھ قبول کیا تو مجھے خبر ہی نہ رہی کہ میں کہاں ہوں۔

"دس ایک روز بعد ایک موقعہ پھر ملا۔ چائے پیتے ہوئے مجھے لگا کہ وہ جو باتیں کر رہی ہے ان میں کبھی میٹھی سی چبھن ہوتی ہے، کبھی کسک اور کبھی گُدگُدی۔ اس نے بنگلہ کا ایک گیت بڑی دھیمی آواز میں گایا۔ پھر وہ بنگلہ شاعری کی باتیں کرنے لگی۔ جو میری سمجھ سے بالا تھیں۔ مگر وہ جو کچھ بولتی تھی، جس سُر میں گاتی تھی اور سَر کو حرکت دیتی ہوئی چہرے کے بھاؤ بدلتی تھی وہ سب کچھ بڑھیا تھا۔ اس کے جواب میں میرے پاس کچھ بھی بڑھیا نہیں تھا۔ مجھے تو صرف یہی محسوس ہو رہا تھا کہ اس گیت کے سُر، اس کے ہونٹوں اور آنکھوں کی پلکوں اور اَبرؤں کی حرکتیں میری نس نس میں چُبھ رہی تھیں۔ وہ چپ ہوئی تو میں اُٹھ کر اس کے نزدیک کھڑا ہو گیا۔ اس کی بھوئیں تن گئیں۔ کہنے لگی 'یہ کیا جانوروں کی طرح پیچھے پڑ جاتے ہو؟'... اس وقت میں سچ مچ جانور ہی تھا۔ میرے اندر میرا جانور ہونا ختم ہوتا تھا تب میں کچھ اور سوچنے سمجھنے کے قابل ہوتا تھا... پتہ نہیں کیوں جب میں اس کے پاس چلا جاتا تھا تو میرے دل کی دھڑکن اتنی تیز ہو جاتی تھی کہ مجھے خود اس کی آواز سنائی دینے لگتی تھی۔ پھر لگاتار سنائی دیتی رہتی تھی۔ جیسے گھوڑے کے سُموں کی ٹاپ ہو۔ آہستہ آہستہ وہ ٹاپ اتنی بلند آواز ہو جاتی کہ مجھے اور کچھ سنائی ہی نہیں دیتا تھا۔ بس گھوڑا سرپٹ دوڑتا رہتا۔

"یہ بات ایک دن میں نے اسے بتائی تو وہ بہت ہنسی۔ کہنے لگی۔ ہمارے ہاں ایک لوک گیت میں آتا ہے 'گھوڑے لگاموں سے ہی خوبصورت لگتے ہیں'۔

"اس کے گھر سے اُٹھ کر جاتا تو مجھے کچھ بھی اچھا نہ لگتا۔ گھر، بیوی، بچّے، دفتر کے دوست۔ کچھ بھی نہیں۔ دفتر میں دل نہ ٹھہرتا تو چھٹّی لے لیتا۔ گھر چلا جاتا تو میم وجہ پوچھتی۔ بیماری کا بہانہ بناتا تو وہ ڈاکٹر کے پاس جانے کو مجبور کرتی۔ میں یونہی کوئی ٹونک لے کر لوٹ آتا۔ شہر میں گھومتا رہتا۔ بلآخر اس کے گھر چلا جاتا۔ بار بار کے میرے آنے پر وہ بھی پریشان ہو جاتی۔ مجھے تلخ نظر سے دیکھتی۔ ایک دن کہنے لگی 'میں ایسی ویسی عورت نہیں ہوں۔ آپ کیا سمجھ کر آجاتے ہیں؟' میں کیا کہتا۔ مجھے یہ بات بنانے کا سلیقہ ہی نہیں تھا کہ جب میں اس سے دُور ہو جاتا ہوں تو میری جان نکلتی رہتی ہے۔ وہ دکھائی نہیں دیتی تو پریشان رہتا ہوں۔ ملتی ہے تو بھی پریشان رہتا ہوں۔ پاس بیٹھتا ہوں تو بلڈ پریشر بڑھنے لگتا ہے۔ دور ہو جاتا

ہوں تو گھٹنے لگتا ہے۔عجیب دلدل میں پھنس گیا تھا۔

"ایک دفعہ جناب میں بہت بے تاب ہو گیا۔ مجھے لگا کہ گھوڑا بے لگام ہو گیا ہے۔ مجھے اس کی ٹاپ کی آواز بھی سنائی دینے سے ہٹ گئی ہے ... مجھ سے ایک غلط سی حرکت ہو گئی تو اس نے مجھے بہت برا بھلا کہا۔ یہاں تک کہا کہ میں اسی وقت اٹھ کر اس کے گھر سے چلا جاؤں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے میری آسے ... مجھے اپنی بے عزتی کا شدت سے احساس ہوا۔ خود کی بہت لعنت ملامت کی۔ فیصلہ کیا کہ پھر نہیں جاؤں گا اس کے گھر۔ لیکن چار پانچ روز کے بعد میں پھر اس کے گھر میں تھا۔ پہلے تو اس کے گھر کو جاتا ہوا غصے میں آیا ہوا تمھارے گھر چلا گیا تھا۔ وہاں سے نکل کر میں نے اپنے گھر جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ مگر اس کے گھر کا گیٹ آیا تو میں اندر چلا گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ کچھ نہ بولی۔ کروشیئے سے کچھ بناتی اور مجھے دیکھتی رہی۔ میں کھڑا دیکھتا رہا پھر واپس جانے لگا تو اس نے میری بانہہ پکڑ لی۔ کہنے لگی 'ناراض ہو گئے ؟'' میں کیا کہتا۔ کچھ کہنے کے قابل ہی نہیں تھا۔ بیٹھ گیا۔ وہ کافی بنا کر لائی۔ کافی پیتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ مجھے تو کچھ سوجھ ہی نہیں رہا بولنے کے لیے۔ وہ میرے اچھے، نیک اور پُر خلوص انسان ہونے کے تعریفی جملے بولتی رہی۔ اس نے ایسی سیدھی بات نہیں کہی کہ وہ میرا انتظار کرتی رہی ان دنوں۔ وہ اپنے رویے پر شرمسار ہے ... دفتر کا خیال آنے پر میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر چوما اور الوداع کہتے ہوئے کہا' ان خوبصورت ہاتھوں والا کوئی عظیم شخص ہونا چاہیے۔ اپنے ارد گرد پھول کھلانے والا!

ایک دفعہ میں تیرے گھر گیا۔ بھابی نے بتایا کہ آشا بیمار پڑی ہے۔ اُسے کئی روز سے ہلکا ہلکا بخار آرہا ہے... سکسینہ صاحب اُسے ڈاکٹر کو دکھا کر دوائی دلوا کر ٹور پر چلے گئے ہیں۔ بخار اُترا نہیں ابھی تک ... میں اس کے پاس گیا۔ پوچھا' سٹول اور پیشاب چیک کرایا؟' اُس نے بے زاری ظاہر کرتے ہوئے کہا! کون کرائے ؟' میں نے کہا' لعنت ہو مجھ پر۔ تم مجھے اپنا کچھ نہیں سمجھتی ؟ مجھے کیوں نہ بلایا ؟'

"میں نے دفتر کو لیٹ آنے کا فون کیا اور اس کا سٹول اور پیشاب چیک کرانے کو لے لیا۔ بھابی کو میں نے یہی بتایا کہ دوا لینے جا رہا ہوں۔

"تمھارا سارا کنبہ اس کی خدمت میں لگا رہا۔ وہ ٹھیک ہوگئی اور سب کا احسان مانتی رہی۔ اس کا خاوند آیا تو اسے آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے شملہ لے گیا۔ میں اداس ہو گیا۔ کھانے، پینے، باتیں کرنے اور کام کرنے کے تمام مزے ختم ہو گئے۔ اپنا یہ فلمی سا رویّہ خود مجھے بھی فضول سا محسوس ہوتا۔ تجھے اگر پتہ چلتا تو پتہ نہیں مجھ پر کتنی لعنتیں بھیجتا۔

"وہ آئی تو مجھے پھر محسوس ہونے لگا کہ میرے وجود کا آدھا حصّہ پھر میرے حکم کے باہر ہو چلا ہے۔ میں اپنے اس آدھے حصّے کو اس کے گھر جانے سے روکتا۔ دل میں گردبار سا اٹھتا تو دفتر سے تھوڑی دیر کی چھٹی کر کے اٹھ جاتا۔ مگر کبھی سڑک سے ہی لوٹ آتا اور کبھی ان کے گھر کے گیٹ سے ... اور کبھی خود کو گھسیٹ کر اس کے گھر کے اندر ڈال دیتا۔

"ایک دن کرناٹک کی ایک فرم کے منیجر نے مجھے تین ساڑھیاں دیں۔ ان میں سے ایک تھی تو بڑی قیمت کی مگر پرنٹ بہت شاندار تھا۔ میں نے چپکے سے وہ ساڑھی لپیٹی اور اس کے گھر چلا گیا۔ اس نے ساڑھی کھولی۔ پسند کی۔ لیکن پھر کرسی پر بیٹھ کر سوچتی رہی۔ وہ مجھے پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ چہرے سے سرخی ٹپکنے لگی تھی۔ شملہ نے اس کا رنگ نکھار دیا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھامنا چاہا تو اس نے سر ہلا کر 'نا' کہہ دی۔ اور کرسی پر بیٹھی ایک ٹانگ ہلاتی رہی۔ میرے اندر چاہت، ناامیدی، غصّہ، ہتک اور پتہ نہیں کیسے کیسے احساسات آپس میں گھلتے ملتے رہے ... پھر گھوڑے کی ٹاپ کی آواز ایک دم تیز ہو گئی۔ جیسے چمک گیا ہو۔ ایک دم بدک گیا ہو۔ وحشی ہو گیا ہو۔ مالک کے چابک سے بھی باغی۔ میں نے اس سے زور زبردستی کرنا چاہی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ مجھ سے اتنے زور سے دبایا گیا کہ اس کی چیخ نکل گئی۔ وہ رونے لگی۔ میں گونگا بنا کھڑا رہا۔ اس نے اٹھ کر میرا اترا ہوا چہرہ دیکھا۔ پھر تپائی پر سے ساڑھی اٹھائی اور پٹک دی فرش پر۔ انگریزی میں اس نے مجھے بے رحم، بدتمیز، غیر مہذب اور پتہ نہیں کیا کیا کہا۔ حکم دیا کہ اسی وقت میں اس کے گھر سے نکل جاؤں اور پھر کبھی نہ آؤں۔

"مجھے بہت شرم آئی۔ ڈر بھی لگا۔ دکھ بھی ہوا۔ اس کے ہاتھ پر میں نے تو دباؤ ڈالا ہی نہیں تھا۔ اس کا ہاتھ تو جیسے ربڑ کا تھا۔ میں اپنی بے وقوفی پر پچھتاتا رہا۔ راستے میں سوچتا رہا۔ چلو چھوڑو جی۔ کیا رکھا ہے اس پاگل پن میں؟

"لیکن پانچ ایک روز بعد میں پھر اس کے گھر میں تھا۔ بچّے گھر پر نہیں تھا۔ اسکول چھوڑا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کا چہرہ پتھر کا ہو گیا۔ میں نے اپنی غلطی تسلیم کی۔ وہ دُکھی سی بیٹھی رہی وہ سمجھوتے کے موڈ میں نہیں تھی۔ میرا بلڈ پریشر پھر یک لخت بڑھنے لگ گیا۔ پھر پتہ نہیں مجھے کیا ہوا۔ میں اس کی چپل اُٹھا کر اپنے سر میں مارنے لگا۔ اور کہتا رہا: 'میں اسی لائق ہوں' اس نے اُٹھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ کھڑی کھڑی میرے ہاتھ کے اوپر اپنا ہاتھ سہلایا۔ کہنے لگی 'تجھے کیا ہو جاتا ہے؟' میں رونے پر قابو نہ پا سکا۔ میرے اندر کچھ ٹوٹنے بکھرنے لگا تھا۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا 'میں تجھے ملے بنا نہیں رہ سکتا۔ مجھ پر رحم کر۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچّے ہیں'۔ میں کُتّے کی طرح اس کے پیر چومنے لگا۔ اس نے پیر نہیں کھینچے۔ ویسے مجھے ہٹاتی رہی۔ پھر پیچھے ہٹ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ آنکھیں بند کر کے سوچتی رہی... تبھی مجھے یاد آیا کہ میں نے تو کرناٹک والی پارٹی کو تین بجے کا وقت دے رکھا ہے۔ میں اُسے سوچتی کو چھوڑ کر لوٹ آیا۔

"دفتر سے گھر کو جاتا ہوا سوچتا رہا کہ یہ میں کیا کر رہا ہوں؟... رات کو بھی یہی خیالات حاوی رہے... تبھی مجھے اپنے چھوٹے شہر کی ایک بات یاد آئی... جاگیردار اجمل خاں، جس کی پیٹھ پیچھے بات کرتے ہوئے لوگ 'اجو پٹھان' کہتے تھے، بہت رعب داب والا شخص تھا۔ وہ گھوڑی پر گزرتا تھا تو دروازے میں بیٹھے لوگ اُٹھ کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ اس کی گھوڑی کسی کے کھیت میں چلی جاتی تھی تو اُسے چپکے سے تو نکالا جا سکتا تھا مگر لاٹھی نہیں ماری جا سکتی تھی۔ نہ ہی شکوہ شکایت کی جا سکتی تھی۔ وہ پنج نمازی تھا۔ شراب نہیں پیتا تھا۔ کسی غریب کے ساتھ کسی جاٹ کو زیادتی نہیں کرنے دیتا تھا عورتوں کے ساتھ زیادتی تو وہ بالکل برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

"اس عمر میں جب اس کا بیٹا جوان ہو گیا تھا۔ اس کا ایک کنجری نعمتاں کے ساتھ عشق ہو گیا تھا۔ اجمل خاں پہلے تو اس کے کوٹھے پر جاتا رہا۔ پھر اُسے اپنے شیش محل میں بُلا کر مُجرے کراتا رہا۔ کہتے ہیں جب اس کا بڑا بیٹا نور خاں اس پر اعتراض کرنے لگا خاں نے زمین کا ایک خطّہ فروخت کر کے نعمتاں کے لیے لاہور میں کوٹھی بنوا دی تھی، اور خود بھی اس کے پاس ہی رہنے لگ گیا تھا۔ کہتے ہیں، لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ اجمل خاں پٹھان اس کنجری کی جوتیاں صاف کیا کرتا تھا۔ وہ کہتی تو گھٹنوں کے بل چل کر گھوڑا بن جاتا تھا۔ وہ اس کے منہ میں

لگام ڈال کر اپنی چنری کا چابک مارتی تھی تو خان گھوڑے کی طرح ہنہنا کر قالین پر چوپایوں کی طرح چل کر نعمتاں کو خوش کیا کرتا تھا... یہ بات سوچتے ہوئے مجھے اپنا آپ گھوڑ بنا دکھائی دیتا۔ اور اندر سے ہنہنانے کی آوازیں آتیں۔ میم پوچھتی کیا بات ہے؟.... نیند نہیں آرہی؟ میں 'ہاں' کہتا اور اس کے مشورہ پر نیند کی گولی کھا لیتا۔ وہ سمجھتی تھی کہ ہوسکتا ہے کہ دفتر کے کام کی پریشانی ہو۔

"کچھ روز ہوئے انتہائی پریشانی کے عالم میں ایک مہینہ کی چھٹّی لے کر میں دہلی چلا گیا۔ آوارہ پھرتا ہوا دوستوں سے ملتا رہا۔ مگر تین روز میں ہی اُکتا گیا۔ اندر گردبار سا اُٹھا تو لَوٹ آیا۔ سیدھا اس کے گھر گیا۔ مگر وہاں تالا پڑا ہوا تھا۔ پھر بھی میں اپنے گھر نہیں گیا۔ دفتر سے چھٹّی پر تھا نا۔ ایک چائے خانہ میں چھپ کر بیٹھا رہا۔ ایک گھنٹہ کے بعد پھر گیا تو وہ گھر پر ہی تھی۔ میں نے نمسکار کیا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف سر کو تھوڑا سا ہلا دیا۔ بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہا۔ میں خود ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ ایک ٹانگ پسارے دیوان پر بیٹھی کڑھائی کرتی رہی۔ "میں چرن وندنا کے لیے آیا ہوں۔" وہ خاموش بیٹھی ٹانگ ہلاتی رہی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کا پاؤں پکڑنا چاہا تو اس نے اپنا پیر کھینچ لیا۔ انگریزی میں کہنے لگی 'بھلا مانس بن کر بیٹھ'۔ مجھے لگا کہ وہ چاہتی ہے کہ آج پھر میں کتّے کی طرح جھک کر اس کے پاؤں چوم کر اسے مناؤں۔ اس کے تلوے چاٹوں... پھر پتہ نہیں کہ مجھے کیا ہوا۔ میں نے اُٹھ کر اس کے چانٹا دے مارا۔ اس کے کھلے بال پکڑ کر گھمائے۔ اور اسے فرش پر پٹک دیا۔ کچھ گندی گالیاں بھی دیں۔ اور باہر نکل گیا... پھر موڑ پر میرا پیچھا کر کے تُو نے مجھے پکڑ لیا۔

"آج میں خوش ہوں۔ آزاد ہوں۔ نکل آیا ہوں ذلّت کی دلدل میں سے.... آج شراب منگوا۔ ہم دونوں جی بھر کر پئیں گے۔" کہہ کر اس نے سَو سَو کے نوٹ نکال کر میرے آگے رکھ دیئے۔

"سمجھا بات؟" میں نے اپنی موسی کے بیٹے ماسٹر رمیش سے پوچھا "سو گیا ہے؟"

"نہیں تو!" وہ گڑبڑایا سا آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھتا ہوا بولا "تُو بتا رہا تھا کہ

تم شراب پینے لگے تھے۔

'پھر کیا ہوا؟' اس نے اُٹھ کر سگریٹ سلگا لیا۔ میں بھی سگریٹ سلگا کر تازہ دم ہو کر بتانے لگا۔...

"پھر بھائی۔ میں نے سکسینہ کو بہانہ بنا کر کہا کہ میرے رشتہ دار کو مکان کی ضرورت ہے۔ مکان خالی کر دو۔ لیکن اسے کوئی اور مکان تلاش کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ اس کا تبادلہ دلی کا ہو گیا تھا۔

"اُن کے جانے پر کچھ روز بعد اورنگ آباد سے ایک خط آیا۔ آشا کی طرف سے اپنی سہیلی کے نام لکھا ہوا تھا۔ سہیلی کا پتہ ٹھیک نہ ہونے کے سبب خط لوٹا دیا گیا تھا۔ مسز سکسینہ نے لکھا تھا... تُو نے یہ تو لکھا ہی نہیں کہ تم لوگ اور کتنے روز اورنگ آباد رہو گے۔ سکسینہ صاحب کا تبادلہ ہونے والا ہے۔ شاید ہم اس ماہ دلّی چلے جائیں۔

تُو نے اپنے پنجابی پڑوسی کے بارے میں جو تجربہ لکھا تھا، میرے لیے تو اُلٹا ثابت ہوا ہے۔ کچھ عجیب سا بھی۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ لوگ اچھا کھاتے، اچھا پہنتے ہیں۔ مگر مزاج کے کڑوے ہیں۔ احساس لطیف سے بے بہرہ ہیں۔ ان کا مزاج مدھیہ پردیش کے بیوت قبیلہ کے لوگوں سے ملتا جلتا ہے۔ جو کھانے پینے کا جشن کرتے ہیں تو کئی روز جانور مارتے، بھونتے، کھاتے اور شراب پیتے رہتے ہیں۔ شادیاں کرتے ہیں تو قبیلہ کی ایک بھی لڑکی کنواری نہیں رہنے دیتے۔ لڑتے ہیں تو خاندان کے خاندان ختم کر دیتے۔... پنجابی ہر کام دھواں دھار کرتے ہیں۔ خواہ لباس اور زیورات کا دکھاوا ہو یا خرچ کرنا ہو۔ پیار اور نفرت بھی شدّت سے کرتے ہیں... ایسے ہی ایک بکھیڑے میں میں بھی پھنسی ہوئی ہوں۔

سکسینہ صاحب کا ایک دوست ہے۔ اکثر گھر میں آتا رہتا ہے۔ بڑا سادہ، شریف اور پُرخلوص شخص ہے۔ سچ بولنے والا اور دوسرے کے کام آنے والا بھی۔ مجھے وہ اس لیے بھی اچھا لگا کہ اسے رنگوں اور تصویروں کو سمجھنے کی سوجھ بوجھ ہے۔ وہ خوبصورت چیز کو دیکھ کر تعریف کر سکتا ہے۔... دو چار ملاقاتوں کے بعد مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کی پیشانی اور آنکھوں کی چمک، سوچ کی گہرائی اور آواز کی تھرتھراہٹ مجھے لُبھاتی ہے۔ مجھے بہت عرصہ کے بعد کسی بھلے مانش کی محبت

کے سکھ کا احساس ہوا۔ اور بوریت کے بوجھ کے دباؤ کا پتہ چلا۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر چائے پی کر اور باتیں کر کے انوکھے لطف کا احساس ہوا۔

لیکن میرا اکیلی ہونے کا ڈر تیرے جیسا نہیں تھا، جھٹکا دینے والا یا کوئی ایڈوینچر کرنے کے لیے اُکسانے والا۔ مجھے تو وہ متوازن سی کیفیت لگتی تھی۔ سکھ دینے والی۔ دل میں میٹھی سی خوشبو پیدا کرنے والی۔ جو آہستہ آہستہ تمھارے اندر سے نکلے اور چاروں طرف نشہ سا گھول دے۔ جو کسی کو بے چین نہ کرے۔ بلکہ بے چینی کے درد کو رسیلا بنا دے۔

جب ہماری کئی ملاقاتیں ہوئیں تو مجھے محسوس ہونے لگا کہ میرا دل کمزور پڑنے لگا ہے۔ وہ نہ آتا، مجھے اس کا انتظار رہتا۔ جب چلا جاتا، میں اُداس ہو جاتی۔ پھر یہ سوچ مجھے ڈرا بھی دیتی کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟... کہیں تیرے والا تو نہیں؟...

میں جس انجام سے ڈرتی تھی، اپنی کمزوری سے، وہ نہیں ہوا۔ بلکہ ایک اور ہی ہونے لگ پڑا۔... چند ملاقاتوں کے بعد ہی وہ جذباتی ہو گیا۔ اس کے اندر مدھیہ پردیش کے آدی باسیوں کی طرح چوما سے رام گنگا والا سیلاب آ گیا۔ وہ پیار بتاتا تو وحشیوں کی طرح حملے کرنے لگتا... وہ خود کہتا کہ اس کے اندر کوئی گھوڑا دوڑتا ہے۔ جس کے دوڑنے کی آواز سنائی دیتی ہے... لیکن مجھے لگتا ہے کہ اس کے اندر کا گھوڑا سدھائے جانے والی نسل کا نہیں ہے۔ مجھے کبھی وہ بہت بُرا لگتا تو کبھی بہت اچھا... آہستہ آہستہ مجھے پتہ چلا کہ اس کے دل میں لطیف احساس والی کوئی بات ہی نہیں۔ اس کے سُر میں سُر نہیں۔ وہ کپڑوں کے سجاوٹی رنگوں اور ڈیزائنوں کی باتیں کر لیتا تھا کہ وہ ٹیکسٹائل فرم میں کام کرتا تھا۔ میں نے بہت کوشش کی اس کی سوچ کو بدلنے کی اور اس میں تحمّل پیدا کرنے کی۔ پیار کی باتیں کرنے پھر ان کے بارے میں سوچ کر لطف کو محسوس کرنے کی۔ لیکن اس کا آدی باسی ہونا نہ گیا۔ اس بات سے میں بہت دُکھی ہو جاتی۔

میں نہیں سمجھتی کہ اس کا مقصد مجھے تکلیف پہنچانا ہے۔ وہ تو محبت کے سیلاب میں بہہ کر پاگل ہو جاتا ہے۔ وہ بھول ہی جاتا ہے کہ اس کی حرکت سے مجھے کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ وہ میرا ہاتھ دباتا یا بانہہ پکڑتا یا مجھے اپنی بانہوں میں لیتا۔ میری ہڈّیاں چٹخ جاتی تھیں۔

ایک بار میں نے چاہا کہ اسے سختی سے روک کر سمجھاؤں۔ لیکن اس نے اس وقت رائی کا

پہاڑ بنالیا۔ ایک دم بپھر گیا۔ روٹھ کر بھاگ گیا۔ ایک روز مجھے بھی غصّہ آگیا۔ میں نے اس کی دی ہوئی ساڑھی فرش پر پٹک دی۔ وہ کھسک گیا۔

پھر ایک روز آیا تو "سوری"، کہہ کر بات ختم کرنے کے بجائے میری چپل اُٹھا کر اپنے سر پہ مارنے لگا۔ میں نے روکا تو دھائیں دھائیں کرکے رونے لگا۔ میں تو پھنس گئی اس حالت میں۔ مجھے بہت شرم آئی۔ ترس بھی آیا اس کی اور اپنی حالت پر۔ سوچا، پر ارتھنا کی کہ میرے اور اس کے درمیان کا رشتہ ختم ہوجائے تو اچھا۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ بات یہیں پر ختم کردی جائے۔

وہ ایک شام پھر آیا۔ میں ابھی فیصلہ بھی نہیں کرپائی تھی کہ اس کے تئیں میرا رویّہ کیا ہو کہ وہ منہ میں ہی بڑبڑایا۔ میں انتظار میں تھی کہ وہ بولے۔ دل کی بات واضح کرے۔ لیکن پتہ نہیں اسے کیا ہوا تھا کہ ایک دم مجھ پر حملہ آور ہوگیا۔ میرے بال پکڑ کر مجھے فرش پر پھینک دیا۔ اور بھنبھناتا ہوا باہر نکل گیا... میں حیران پریشان رہ گئی۔

للتا۔ تم بتا سکتی ہو کہ اس کا ایسا رویّہ کیوں ہے... لکھنا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟... تیرے جواب کا انتظار بے صبری سے کروں گی..

"تم سن رہے ہو رمیش؟" میں نے پوچھا تو وہ کب کا سوچکا لگتا تھا...

اگر وہ جاگ رہا ہوتا تو میں نے اسے بتا دینا تھا کہ یہ کہانی میرے دوست کی نہیں۔ میری ہے.... اور یہ بھی بتا دینا تھا کہ میں نے اس خط کے جواب میں آشا کو لکھا تھا... آشا اس جنم میں تُو نے مجھے جو دُکھ دیا ہے میں اگلے جنم میں بھی اس کا انتظار کروں گا۔

بچّے کی شرارت

یونیورسٹی کے چپڑاسی نے جب پروفیسر اندرا سوری کو چِٹھّی لاکر دی تو اس کا پیریڈ لگنے والا تھا۔ اس نے جلدی سے اِن لینڈ کھولا۔ پڑھا۔ پرس میں ڈالا اور کلاس روم میں چلی گئی۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ٹیکس ڈھانچے کے بارے میں پڑھاتے ہوئے اسے لگا کہ وہ جو حوالے دے رہی ہے، وہ ٹھیک نہیں۔ وہ دو مصنّفوں کے حوالے ایک دوسرے کے نام سے دے رہی تھی۔ اس کی توجہ چِٹھّی میں تھی جس کو پڑھ کر پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کس نے لکھی ہے؟ اسے پروفیسر سِدھو کی طنز یہ بات یاد آگئی۔ اُس عمر میں نام تو کُجا واقعات بھی بھولنے لگتے ہیں۔ اور آخر میں یہ ہوتا ہے کہ اپنی زندگی کا کوئی واقعہ یاد کرنے کے لیے ڈائری دیکھنا پڑتی ہے...
وہ طالب علموں کو 'بس دو منٹ'، کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ گرمی نہیں تھی مگر اسے پسینہ آرہا تھا۔ اس نے پیاس کے بغیر پانی پیا۔ پرس میں سے نکال کر چِٹھّی پڑھی۔ مسکرائی اور چِٹھّی پرس میں رکھ کر پھر کلاس روم میں چلی گئی۔

گھر آکر اس نے لباس تبدیل کیا اور اپنے کمرے میں بیٹھ کر ایک بار پھر وہ چِٹھّی پوری تسلّی سے پڑھی۔ سوچتی رہی لکھنے والا کون ہو سکتا ہے؟ چِٹھّی ڈائری میں رکھ کر سوچتی سوچتی وہ کھانے کی تیاری میں لگی رہی۔ فائنل میں پڑھتی بیٹی، پریپ میں پڑھتا بیٹا اور شوہر پروفیسر سوری کھانے کے انتظار میں تھے۔

بیٹے سے رائتہ گر گیا تو پروفیسر سوری جھنجھلا گئے۔ انھوں نے ڈانٹا تو ماں نے جھلّا کر باپ کی طرف دیکھا۔ باپ نے نظریں نیچی کرلی۔ ماں مسکرائی۔ 'بس اتنے میں ٹمپر لوز... پرسوں آپ سے جناب اچار کا مرتبان گر کر ٹوٹ گیا تھا،

سن کر شوہر نے موٹے شیشوں والی عینک اُتاری اور سر کے آدھے حصّے تک پھیلے اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھا۔ رومال رکھ کر بیوی کی طرف دیکھا۔ لیکن کہا نہیں کہ جب میں بچّے کو جھڑکتا ہوں تو تم بیچ میں کیوں بولتی ہو۔ جب تم جھڑکتی ہو تو میں بیچ میں بولتا ہوں کیا؟...

بیوی سمجھ گئی۔ وہ مسکراہٹ چھپاتی پیچھے سے آلو کاٹنے لگی۔

ممّی اپنے کمرے میں جاکر لیٹ گئی۔ اُس نے ڈائری اُٹھائی ہی تھی کہ بیٹا آگیا۔ بڑے پیار سے آلاہنا دیتے ہوئے بولا "مما... ایک مہینہ ہوگیا، فلم دیکھے ہوئے۔ ٹی وی پر تھرڈ کلاس فلمیں آتی ہیں... یہ شام کا شو دیکھ آؤں گا؟"

ممی کچھ سوچ کر آنکھوں میں مسکرائی۔ پھر کچھ سوچنے کا بہانہ کرتی ہوئی بولی "اچھا جاؤ۔ مگر اپنے پاپا سے پوچھ لینا۔ ویسے اوکے... خیال رکھنا۔ وہاں کوئی فضول چیز نہ کھانا اور سیدھے گھر آنا۔ سمجھا؟"

کچھ دیر بعد مسز سُوری بیڈ روم کی طرف گئی۔ بیٹی سو رہی تھی۔ وہ شوہر کے کمرے میں گئی۔ وہ اپنی ٹانگیں کھڑکی میں ٹکائے تھکاوٹ اُتار رہے تھے۔ عینک اُتار کر ایک طرف رکھی ہوئی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ دونوں بازو باندھ کر سینے پر رکھے ہوئے تھے۔ ان کا چہرہ دیکھتے ہوئے مسز سُوری کو محسوس ہوا کہ وہ کچھ عرصے سے تیزی سے بوڑھے ہو رہے ہیں۔ ان کی آنکھوں کے نیچے ماس کی پوٹلیاں سی بن گئی ہیں۔ گلے میں کالے دھاگے سے بنے دکھائی دیتے ہیں۔ چہرے پر جگہ بہ جگہ جھرّیاں پڑ گئی ہیں۔ ٹھوڑی کے نیچے ماس لٹکنے لگا ہے۔

بیوی پیچھے ہٹ کر ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔ اس نے صوفوں کے کور ٹھیک کیے۔ کُشن ترتیب سے رکھے۔ میز پر لگے ہلکے سے داغ کو اپنی نائٹی کے پلّو سے پونچھا۔ چاروں طرف نظر دوڑائی اور ڈریسنگ ٹیبل کے آگے بیٹھ گئی۔ اسے لگا کہ اس کے چہرے کی جلد ذرا ڈھیلی پڑ گئی ہے مگر گالوں پر ابھی بھی تازگی ہے۔۔ مسز شرما کی طرح اس کے ہونٹ دانتوں اور مسوڑھوں سے دور نہیں ہوئے۔ چھاتیاں بڑی ہوگئی ہیں مگر لٹکی نہیں۔ دو بچّے پیدا کرنے اور بریسٹ فیڈنگ نہ دینے کا یہی تو مزہ ہے... اسے دو ہی بچّے کافی فیملی پلاننگ والوں کا نعرہ یاد آگیا۔ وہ ہنس دی۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کی مالش کی۔ آئینے میں دیکھا۔ وہ لال ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں نشہ سا آگیا۔ اس نے انگوٹھے اور ایک انگلی سے اپنی ناک دبا کر اور تیکھی کر لی۔ پھر

اپنے سر کے بھوّرے بالوں پر ہاتھ پھیرے۔ ان بالوں کی خوبصورتی کی تعریف اس چِھٹّی پر لکھی ہوئی تھی۔ لکھنے والا اس کے اس چہرے، ناک، آنکھوں اور بالوں کو سامنے بیٹھ کر دیکھنے کی حسرت میں مر رہا ہے۔

کھڑی ہو کر اس نے اپنے سارے بدن کو دیکھا۔ اس کا دل چاہا کہ کوئی ایسی حرکت کرے جس سے جوانی کا احساس ہو سکے... اس کے ہاتھ خود بخود کنگھی کی طرف چلے گئے۔ اس نے بال سنوارے، لمبے گھنے اور بھوّرے کالے بالوں کے درمیان دمکتا چہرہ... دلفریب لگ رہا تھا۔ چِھٹّی لکھنے والے کی نظر سے۔ اس نے ہلکا سا میک اَپ کیا اور اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ دیوان پر لیٹنے لگی تو اس کے منہ سے 'ہوں' کی آواز نکل گئی۔ اسے پروفیسر سدھو کی کہی بُری سی بات پھر یاد آ گئی... جب ہمارے منہ سے اچانک رام، اوم یا واہگورو نکل جائے تو سمجھو بڑھاپا دستک دے رہا ہے'... 'بکواس کرتا ہے سِدھو' سوچ کر اس نے انگریزی ہی کا ایک ناول اُٹھایا اور پڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر جلد ہی اسے نیند آ گئی۔

گیٹ کی کال بیل سے جب اسکی آنکھ کھلی تو پروفیسر سدھو' دروازہ کھولو۔ دِلّی والے کیا دن دہاڑے سو گئے' کہتا ہوا اندر آ رہا تھا۔ مسز سُوری نے یہ سوچ کر کہ اس کے خاوند سوئے ہوئے ہیں پروفیسر سدھو کو اپنے ہی کمرے میں بِٹھا لیا۔

سِدھو نے لطیفہ بازی شروع کی تو مسز سُوری انتظار میں رہی کہ وہ کہیں رکے تو وہ بھی اپنی بات کرے... وہ پروفیسر سِدھو سے کبھی کبھار وہ باتیں بھی کر لیتی جو وہ اپنے شوہر سے بھی کرنا نہیں چاہتی تھی۔ سِدھو کے ساتھ دو باتیں کر کے دل و دماغ تو تیست ہو جاتا تھا... سِدھو نے فٹافٹ اسے دو لطیفے سنا ڈالے۔ جو اس نے کہیں سے پڑھے' سُنے یا راستہ میں ہی خود بنائے تھے۔ وہ ان کو سُن کر ہنسی بھی۔ ہنسی تھی تو اس نے وہ چِھٹّی نکال کر سِدھو کے آگے رکھتے ہوئے کہا "یہ دیکھو بھلا کس کی شرارت ہے؟"

چِھٹّی پڑھ کر اس نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا "میڈم میری تو نہیں ہو سکتی کیونکہ لکھنے والے نے نیچے لکھا ہے کہ اس کا نام چار حروف سے بنتا ہے۔ میرے نام میں تو پانچ حروف آتے ہیں... اس کے علاوہ وہ آپ کا طالب علم بھی رہا ہے۔ یہ میرے نصیبوں میں کہاں تھا کہ پڑھتے بھی رہو اور اپنی ٹیچر کے خوبصورت چہرے کی طرف تکتے بھی رہو... خیر،

بھئی کمال ہے اس کی محبت۔ دس برسوں کے بعد بھی بھولا نہیں۔"

"نہیں۔ یہ چھٹی لکھی کس کی ہو سکتی ہے؟۔۔۔ یہ شرارت کس کی ہے؟ میڈم نے 'شرارت' پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔

"میڈم آپ کا ننھا منا سا عاشق دو سال آپ کو نظریں مٹکاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ آپ کو پتہ ہی نہیں چلا؟۔۔۔ ادھر کوئی لڑکی چلتی چلتی ذرا آنکھ بھر کر دیکھ لے تو اس کے گھر کی چوکھٹ تو کیا اس کی گلی کی اینٹیں اکھاڑ کر کھا جائیں۔" کہہ کر سدھو نے پوچھا "اچھا بتاؤ۔ آپ جاؤ گے ملنے اسے کل شام کے پانچ بجے بینک روڈ پر، اس کھمبے کے نیچے؟"۔۔۔ لگتا ہے کہ آپ مجھے دیکھتے ہی جھٹ پہچان جاؤ گے۔ چھٹی کی عبادت پروفیسر کے ذہن میں سے گزری۔

"نہیں مجھے نہیں جانا۔۔۔ یہ کیا تماشا ہوا۔" میڈم جھنجلا کر بولی۔

"اچھا تو چلو پروفیسر سوری کو بھی اس تماشے میں شامل کر لیتے ہیں۔ پھر چائے پئیں گے۔" سدھو کہہ کر اٹھنے لگا تو میڈم گھبرا گئی۔ اس نے جلدی سے سدھو کے ہاتھ میں سے چھٹی چھین کر اپنی سخت گرفت میں لے لی۔ کہنے لگی "آپ نفسیات کے اچھے ٹیچر ہو۔۔۔ ان کو اچھی لگے گی یہ؟۔۔۔ خواہ بچے کی شرات ہے۔ مگر کیا پتہ وہ کیا سوچنے لگیں۔"

چھٹی اس نے اپنی ڈائری کے نیچے رکھ دی۔ سدھو اس کی یہ بات سمجھ تو گیا مگر لگی عجیب سی۔

وہ دونوں اٹھ کر ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔ جہاں دونوں بچے بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ سدھو کو دیکھ کر پروفیسر سوری بھی آ گئے۔ تینوں پروفیسر اکٹھے ہوئے تو اپنے اپنے شعبہ اور یونیورسٹی کی سیاست کی باتیں دوہرانے لگے۔

رات کو میڈم لیسن تیار کرنے کے بہانے اپنے کمرے میں بیٹھی رہی۔ وہ ایک کاغذ پر انگریزی کے چار حروف والے نام لکھتی رہی۔۔۔ پریم، روی، ٹیٹو، بٹو، امت، شام۔۔۔ ہاں یہ شام ہو سکتا ہے۔ اسے کئی برس پہلے دیکھے اس لڑکے کا چہرہ یاد آ گیا۔ وہ ہمیشہ پہلی قطار کی ڈیسک پر بیٹھتا تھا۔ رنگ ذرا سانولا تھا۔ جو ذرا سی جذباتی بات سن کر یا کہہ کر لال ہو جاتا تھا۔ اس کی آنکھیں سکڑتی اور پھیلتی تر ہو جاتی تھیں۔ اس میں پتہ نہیں کیا تھا کہ کوئی بھی میڈم اس کی طرف کھنچی جاتی تھی۔۔۔ مگر اس کا نام شام تو نہیں تھا۔ شام تو میں نے رکھا تھا۔

شیام ورن کرشن ۔

میڈم کو اس کا نام نہیں یاد آرہا تھا، مگر چہرہ بھول نہیں رہا تھا، مگر وہ بولتا بہت کم تھا۔ لیکن میڈم کے چہرے کی طرف ایسے تکتا رہتا جیسے چھٹی میں لکھا ہوا تھا۔ جس سے میڈم کو گھبراہٹ سی ہونے لگی تھی۔ وہ اپنا دھیان دوسری طرف کر لیتی تھی لیکن جب نظر اس کی طرف جاتی تو وہ ویسے ہی تکتا ہوتا تھا۔ اس کا نام رونددر یا برجیش تھا۔ وہ روی بھی ہو سکتا ہے۔ اور برج بھی... چار حروف والے نام والا۔ ... کئی برسوں کے بعد خبر ملی تھی کہ وہ دہلی جاکر کمرشیل آرٹسٹ بن گیا تھا۔ نشے والی چیزیں کھاتا تھا۔ حالت بُری تھی۔ سن کر میڈم کو دُکھ ہوا تھا۔

اس نوجوان کی نظروں سے گھبرا کر اس نے ایک بار ڈائری میں لکھا تھا جس میں اس کی عام سی کشش کا موازنہ کرشن اور گوپیوں کے درمیان کی کشش سے کیا گیا تھا۔

میڈم نے میز کا نچلا دراز کھولا۔ پرانی ڈائریاں نکالیں۔ ورق الٹتی پلٹتی رہی جب اسے ان میں سے کچھ نہ ملا تو پرانے کاغذات نکالنے اور پڑھنے لگی۔ اس امید میں کہ شاید اس کی کوئی تحریر مل جائے۔ یا ایسی کوئی تحریر مل جائے جو اس چھٹی کی لکھاوٹ سے ملتی جلتی ہو۔ میڈم کو ایک کاغذ ملا۔ کسی طالب علم نے سارے اسٹاف کو مخاطب ہو کر لکھا کہ یہاں کو ایجوکیشن ہے۔ لیکن طلبہ اور طالبات کے ملنے پر اتنی پابندیاں ہیں کہ ایجوکیشن کا مقصد ہی فوت ہو گیا ہے۔ اسٹاف کے ممبران بھی دو الگ الگ گروپوں میں بیٹھتے ہیں۔ جب تک یہ گروپ اکٹھے ہو کر نہیں بیٹھتے۔ اسٹاف کا طالب علموں کے تئیں رویّہ ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ نے اپنا رویّہ نہ بدلا تو ہم ہڑتال کر دیں گے۔

میڈم نے وہ کاغذ اس چھٹی کے برابر رکھا۔ لیکن ان دونوں کی تحریروں کے حروف نہیں ملتے تھے ... اگر یہ چھٹی اُس آرٹسٹ کی ہوتی تو کوئی نہ کوئی حرف تو ایسے لکھا ہوتا جس سے فنکاری کا مظاہرہ ہوتا ... کرشن تو اتنا شرمیلا تھا کہ کسی لڑکی کے ساتھ بات بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ مجھے خط لکھنے کی جرأت ہی نہیں کر سکتا۔ اس چھٹی کے نیچے دستخط کرتے وقت اس کے ہاتھ ضرور کانپتے ہیں ... مگر کتنی خود اعتمادی ہے لکھنے والے میں۔ لگتا ہے کہ آپ لازمی طور پر آؤ گے۔ مجھے دیکھتے ہی

آپ فوراً پہچان جائیں گے ... ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ سیشن پہلے ہی نکلا ہو پڑھ کر ... لیکن اگر ...
یہ سوچتے ہوئے میڈم کو شرم آئی کہ پھر اُس کی عمر ہی کیا ہو گی۔ مشکل سے چوبیس پچیس برس ... چھوڑو بھی ... سوچ کر جھنجھلا کر اس نے روشنی گل کر دی اور بیڈ روم کی طرف چلی گئی۔

شوہر سوئے ہوئے خرّاٹے مار رہے تھے۔ وہ سانس ناک سے لیتے تھے اور چھوڑتے منہ میں سے تھے۔ بیوی چپکے سے ساتھ کے بیڈ پر لیٹ گئی۔ اسے کافی دیر تک نیند نہ آئی۔ اس کا تخیل اسے اُٹھا اُٹھا کر بینک روڈ کی طرف لے جا رہا تھا۔ اس ذہنی کیفیت سے بچنے کے لیے اس نے خود کو تصوّرات کے حوالے کر دیا۔ ایسا کرنے سے اُسے کچی نیند میں اُس سے ملنے، اُسے پہچاننے اور پہچان نہ پانے کی تصویریں بننے اور مٹنے لگیں ... اور اسے نیند نہ آئی۔

صبح سب نے اپنے اپنے کالجوں میں جانا تھا مصروفیت میں میڈم وہ چِھٹّی اُٹھانا بھول گئی۔ اس کے شعبہ تاریخ میں ایک تو کسی فنکشن کی تیاری کمیٹی کی میٹنگ تھی۔ دوسرے شعبہ کے ہیڈ نے اکادیمک کمیٹی کے ایک ممبر کی شکایت پر انکوائری شروع کر دی۔ سارا دن مُوڈ خراب رہا۔ میڈم گھر آئی۔ پرس میز پر پھینکا۔ تب پتہ چلا کہ وہ چِھٹّی تو میز پر ہی رکھ گئی تھی اس نے چِھٹّی اٹھا کر کتاب کے نیچے چھپا دی۔

لباس تبدیل کر کے بیڈ روم کی طرف گئی تو دیکھا کہ شوہر لیٹے ہوئے ہیں۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ شوہر کو ہائی بلڈ پریشر محسوس ہوا تھا۔ وہ جلدی گھر لوٹ آیا تھا۔ بیوی ایک دم جھنجھلا اُٹھی کہ وہ اپنی صحت کا خیال کیوں نہیں رکھتے ... ٹیوشن کا کام چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ بیوی نے اُس وقت دوائی نکال کر کھلائی اور آرام کرنے کا مشورہ دے کر خود بھی ساتھ ہی لیٹ گئی۔ شوہر سو گیا تو بیوی نے اٹھ کر اِرد گرد دیکھا۔ اور اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔

اسے نام اور تاریخیں یاد نہیں رہتے تھے۔ حوالے بھول جاتے تھے۔ شعبہ کی میٹنگوں اور دوستوں کو ملنے کے لیے دیئے وقت یاد نہیں رہتے تھے۔ مگر اسے چِھٹّی میں لکھا ملنے کا وقت نہیں بھولا تھا۔ وہ کئی بار گھڑی دیکھ چکی تھی۔ لیکن ابھی تین ہی بجے تھے۔ وہ کمرے میں ٹہلنے لگی ٹہلتی ہوئی بیٹے کے کمرے میں گئی۔ وہ اپنے دوست کے ساتھ گپیں ہانک رہا تھا۔ ممّی ان سے ان کی پڑھائی کے بارے میں پوچھتی رہی۔ پھر ان کے ساتھ کیرم کھیلنے لگ گئی اور چوری چوری گھڑی بھی دیکھتی رہی۔

ساڑھے چار بجے وہ اُٹھی۔ ہاتھ منہ دھویا۔ لباس تبدیل کیا۔ میک اَپ کیا۔ اور شوہر کے بیڈ کے سرہانے جا کر کھڑی ہو گئی۔ مسکرائی تو شوہر نے پوچھا "کہاں کی تیاری ہے؟"

"آپ ٹھیک ہیں نا؟ ... آؤ کہیں گھوم آئیں۔ سچ۔ میں تو تنگ آگئی ہوں زندگی کی اس روٹین سے ... ویسے اگر آپ آرام کرنا چاہیں تو ... میں اکیلی ہی چلی جاتی ہوں۔" کہہ کر اس نے شوہر کے کھڑے گھٹنوں پر اپنا سر رکھ دیا۔ بکھرے بال شوہر کے پیروں تک چلے گئے ... اس نے پوچھا "پھر کدھر جانا ہے؟"

"پروفیسر کیلاش کے یہاں چلتے ہیں۔ ہوں؟"...

"اچھا ہو جا تیار۔" شوہر کی بات سن کر وہ پھر ڈریسنگ ٹیبل پر چلی گئی۔

جب شوہر عینک لگا کر باہر نکلا تو پانچ بجنے میں تیرہ منٹ رہتے تھے۔ میڈم گیٹ پر تیار کھڑی تھی۔ اس نے اپنے کالے بھورے بالوں کو کندھوں پر پھیلا رکھا تھا۔ آنکھوں پر شربتی رنگ کے گاگلز لگا رکھے تھے۔ جن سے آنکھوں کے نیچے کی جھرّیاں چھپ گئی تھیں۔ وہ اسکوٹر پر جی ٹی روڈ سے ہوتے ہوئے امبیڈکر چوک سے مڑے تو شوہر نے پوچھا "سیدھے چلیں یا بینک روڈ کی طرف سے؟"

"بینک روڈ کی طرف سے۔" بیوی بولی۔

"مگر وہ دُور پڑتا ہے۔" شوہر نے کہا۔

"شرط باندھ لو۔" بیوی تیزی سے بولی۔

"رہی ایک ایک فلم کی۔"

"اچھا بھئی۔ رہی۔" کہہ کر بیوی نے شوہر کی پیٹھ میں مُکّا مارا۔ اسکوٹر بینک روڈ کی طرف مڑ گیا۔ شوہر نے راستے کو لمبا ثابت کرنے کے لیے اسکوٹر کی رفتار کم کر دی بیوی نے گھڑی دیکھی۔ پورے پانچ بج کر دو منٹ ہوئے تھے۔ اور اس کی نظر اُس کھمبے کی طرف لگی تھی جس کے نیچے اس نے کھڑے ہونے کے لیے لکھا تھا۔ لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ اسکوٹر کھمبے کے نزدیک سے گزر گیا۔

پروفیسر کیلاش گھر پر نہیں تھا۔ تالا پڑا ہوا تھا۔ شوہر نے بیوی کی طرف دیکھا۔ اُس

کا موڈ ایک دم بگڑا ہوا تھا۔ اس نے کڑی نظر سے شوہر کی طرف دیکھا۔ کہا "آؤ اب گھر چلیں۔ اب میں کہیں بھی نہیں جانا چاہتی۔"

موٹر پر آ کر شوہر نے پوچھا "اب کون سے راستہ سے چلیں؟" بیوی نے کہا "جو آپ کی مرضی؟" پھر بھی شوہر بینک روڈ کی طرف سے ہی گزرا۔

گھر پہنچے تو ڈرائنگ روم میں دونوں بچّے اس طرح بیٹھے تھے جیسے لڑائی کر چکے ہوں۔ ممّی نے غصّے سے انگریزی بولتے ہوئے پوچھا "آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ ... ان کی باتوں سے پتہ چلا کہ کسی کی گیند بازی سے کھڑکی کا ایک شیشہ ٹوٹ گیا ہے۔ بس اتنی سی بات پر میڈم خوب برسیں۔ پہلے بچّوں پر، پھر شوہر پر۔ جنھوں نے ان کو سر پر چڑھا رکھا تھا۔ زور سے بول رہی میڈم کے ہونٹوں سے تھوک گرنے لگا۔ اس نے رومال سے تھوک پونچھ دیا۔ اس کے ایک گال پر پھیلی لپ اسٹک کو دیکھ کر بیٹے کی ہنسی پھوٹ پڑی۔ شوہر نے اس کے گال کی طرف اشارہ کیا۔ وہ آئینے کے آگے گئی تو اور بھی جھنجھلا گئی۔ بڑبڑاتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ پیچھے پیچھے خاوند بھی۔ بیوی دیوان پر لیٹتے ہوئے بولی۔ "مجھے تنہا چھوڑ دو۔"

شوہر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اِدھر اُدھر کی سوچتا رہا۔ آخر کار کچھ حوصلہ کر کے اُس نے میز سے وہ چِھٹّی اُٹھا کر پوچھا "یہ چِھٹّی کس کی ہے؟"

بیوی نے کروٹ لے کر بلّی کی طرح جھپٹ کر چِھٹّی چھین کر کہا "تمھیں کیا؟ ... تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے؟"

بیوی کا خیال تھا کہ اب شوہر بھڑکے گا۔ جنگ چھڑے گی۔ لیکن شوہر خاموش رہا۔ بلکہ بیوی کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ دیکھ کر مسکرایا۔ بیوی بوکھلا گئی۔ آواز کو سخت کر کے بولی "آپ ہنستے کیوں ہیں؟ ... میرا تماشہ بنانا چاہتے ہو؟"

"میں؟ ... نہیں تو ... وہ تو تم بن چکی ہو" شوہر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟" بیوی نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"یہ چِھٹّی میں نے لکھی تھی ... تیرا مذاق اُڑانے کے لیے ... میں نے کسی سے لکھوائی تھی ... تم میری تحریر بھی نہیں پہچان سکی؟"

میڈم کے ہاتھ ایک دم ڈھیلے پڑ گئے۔ جسم اَدھموا سا ہو کر دیوار سے لگ گیا۔ اس نے مردہ سی نظروں سے شوہر کی طرف دیکھا۔ اور ڈھیلی سی آواز میں بولی۔ "کیوں؟... کیوں کی یہ شرارت آپ نے؟" کہہ کر وہ تکیے میں ٹکّے مارتی ہوئی اس میں اپنا چہرہ گھُسا کر رونے لگی۔

شوہر خاموش تھا۔ دراصل اس نے یہ شرارت کی ہی نہیں تھی۔ اس نے تو صرف چھٹّی پڑھی تھی چوری سے۔ وہ بیوی کی حرکتوں سے ناراض ہو کر گھر میں سرد جنگ کا سا ماحول پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ پیدا ہو چکے تناؤ سے بھی ڈرتا تھا۔ اس نے نرمی سے کہا۔ "سوری میڈم۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ مجھے بہت افسوس ہے۔"

بیوی نے آنسو بھری آنکھوں سے شوہر کی طرف دیکھا۔ جن میں دُکھ تھا جو تماشہ بننے کا کم تھا اور اس بات کا زیادہ تھا کہ وہ بچّوں والی شرارت اس کے شوہر نے کیوں کی؟... کسی شام نے کیوں نہیں؟

ڈاکٹر شکنتلا

ڈاکٹر شکنتلا ورما سیکٹر بیس کے موڑ پر آم کے تلے اندھیرے میں مجھے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ اس نے ہولے سے کار روکی تھی۔ اُتر کر میری طرف کی کھڑکی کھولی تھی۔ مجھے سہارا دے کر اُتارا تھا۔ میرے کندھے پر میرا بیگ لٹکا کر پوچھا تھا۔ "اب آپ گھر جا سکتے ہیں نا؟"

"ہاں جی... اب میں ٹھیک ہوں" کہہ کر میں نے خود کو متوازن کر کے اپنے پاؤں زمین پر ٹکا لیے تھے۔ اُس نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر دبایا تھا۔ اچھا۔ الوداع، کہہ کر جلدی سے کار دوڑا کر لے گئی تھی۔

مجھے تیسرے روز میرے دوست کپور نے بتایا تھا کہ وہ چنڈی گڑھ تو کیا بھارت ہی چھوڑ گئی ہے ہمیشہ کے لیے... پتہ نہیں اس نے ایک دم یہ فیصلہ کیسے کر لیا... میں آج سوچتا ہوں کہ شکنتلا کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مگر پتہ نہیں کہ اس نے جانے کا فیصلہ میری وجہ سے کیا یا اپنے گھر والوں کے سبب یا دیگر حالات کی بنا پر۔

دماغی امراض کی ماہر ڈاکٹر شکنتلا ورما کے پاس مجھے کپور ہی لے کر گیا تھا۔ مجھے کسی بھی ڈاکٹر کے علاج پر یقین نہیں رہا تھا۔ مگر کئی برس کے علاج سے مایوس ہو کر میں کسی بھی ٹونے ٹوٹکے کو آزمانے کو تیار تھا۔

تکلیف کئی برس پہلے ایسے شروع ہوئی تھی کہ کبھی آدھے اور کبھی پورے سر میں، کبھی ٹانگوں میں اور کبھی باہوں میں درد ہونے لگا تھا۔ پہلے تو یونہی درد کی گولیاں کھا کر کام چلاتا رہا، مگر جب درد لگاتار رہنے لگا تو ڈاکٹروں کے چکر لگاتا، دوائیں کھاتا رہا۔ کبھی کبھی بالکل بھلا چنگا ہو جاتا لیکن چند دنوں کے بعد پھر وہی چکر... جب کبھی دل بیٹھنے لگتا تو محسوس ہوتا تھا

کہ کیا خبر سانس کب ختم ہو جائیں۔ دفتر کی سیڑھیوں پر یا رکشا پر چڑھتے اترتے۔ کہیں سبزی خریدتے ہوئے یا سوتے میں ہی۔

ایک بار کئی روز کی چھٹی دلوا کر کپور نے پی جی آئی کے بہت چکر لگوائے۔ ہر قسم کے ٹیسٹ کرائے۔ مگر نکلا کچھ بھی نہیں۔ ہر ایک ڈاکٹر یہی کہتا کہ یہ دوائی کھاؤ اور آرام کرو۔ لیکن آرام کا مشورہ مجھ پر اُلٹا اثر کر جاتا۔ گھر میں لیٹے رہنے سے اگرچہ درد کم ہو جاتا مگر من کی پریشانی بڑھ جاتی۔ گھبراہٹ ہونے لگتی۔ مجھے دیکھ کر میری بیوی بھی گھبرا جاتی۔ میں چھٹی منسوخ کرا کے دفتر میں جا بیٹھتا۔ فائلیں کھولتا باندھتا۔ ماتحتوں سے باتیں کرتا، سمجھاتا یا ڈانٹتا۔ کپور دفتر میں آ کر میرے گلے پڑ جاتا۔ کہتا، "ارے کمبخت شخص تیری موت اس دفتر کی سیڑھیاں چڑھتے اترتے لکھی ہوئی ہے۔ تیری قسمت میں آرام نہیں"۔ پھر کپور سالا بذاتِ خود ماہر نفسیات بن بیٹھتا "پچاس برس کی عمر کو پہنچے شخص میں بہت تبدیلیاں آتی ہیں۔ اُسے زندگی کی روٹین بُری لگنے لگتی ہے۔ وہ سماجی ذمہ داریوں کا بوجھ محسوس کرنے لگتا ہے۔ موت کا چھوٹا سا خوف پیچھے پڑ جاتا ہے۔ زندگی بے معنی سی لگنے لگتی ہے... ہوتا خواہ ایسا کچھ نہیں۔ ذرا ہمّت سے کام لے تو... بیڑا پار ہو جاتا ہے"۔

کپور نے یہ باتیں کتابوں میں پڑھی تھیں یا میرے ڈاکٹروں سے سُنی تھیں۔ سچ تھیں یا غلط مگر مجھے اچھی نہیں لگتی تھیں۔ سُن کر میں ڈر جاتا تھا۔ ڈر کا ایک سبب اور بھی تھا، ریٹائرمنٹ۔ خواہ کئی برس پڑے تھے۔ لیکن میں خود کو تیار کرنے لگ گیا تھا کہ دن کیسے گزریں گے اس بے کار شخص کے؟ کیا پایا اس زندگی میں؟۔

دراصل بیماری یہ تھی کہ میرے اندر جینے کی خواہش ہی ختم ہو گئی تھی۔ کوئی کام کرتا ہوا میں یہی سوچتا رہتا کہ میں یہ کیوں کر رہا ہوں؟ کون سی کمی رہ جائے گی اس دنیا میں اس کے بغیر؟ ... مجھے معلوم تھا کہ یہ سوچ ٹھیک نہیں پھر بھی میں اپنی اس سوچ کو روک نہیں سکتا تھا۔

جب کوئی بھی دوا کارگر ثابت نہ ہوئی تو کپور مجھے ڈاکٹر شکنتلا ورما کے پاس لے گیا تھا۔ اس کا کلینک مارکیٹ میں نہیں تھا۔ کوٹھی میں تھا۔ بورڈ بھی باہر سے دکھائی نہیں پڑتا تھا۔ لان میں ایک طرف کرسیاں رکھی تھیں۔ پام کے ناٹے بوٹوں کے اردگرد پھولوں کی کیاریاں

تھیں۔ برآمدے کے بائیں کمرے میں ایک بوڑھا ڈاکٹر بیٹھا تھا۔ جو رجسٹر اور کارڈ پر مریضوں کے اتے پتے درج کرتا تھا اور فیس وصول کر کے اندر بھیج دیتا تھا۔

اور کوئی مریض نہیں تھا۔ ہم کارڈ لے کر اندر گئے تو دیکھا کہ وہ ڈاکٹروں جیسا کمرہ نہیں تھا۔ ڈرائنگ روم تھا۔ دو صوفہ سیٹوں کے آگے منجھلے قد کی میزیں رکھی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر ایک طرف بیٹھی تھی۔ اس کے آگے ڈاکٹروں والا کوئی آلا نہیں تھا۔ صرف پیڈ اور پین پڑے تھے۔ کپور نے واقفوں کی طرح نمستے کی اور میں نے مریضوں کی طرح۔ کپور نے انھیں بتایا کہ یہ موہن لال ہے میرا دوست۔

"اچھا... آؤ موہن لال جی۔ میرے نزدیک بیٹھیے۔ دور کیوں بیٹھ گئے؟" اس نے مسکرا کر کہا تھا تو مجھے لگا تھا کہ یہ بھی کوئی ڈاکٹر ہے؟ کپور تو کہتا تھا کہ وہ انگلینڈ میں کئی برس پریکٹس کر کے آئی ہے۔ یہ تو بالکل ویسی لگتی ہے۔ اس نے سبز زمین پر لٹکتے پیلے پھولوں والی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ پلّو کندھے پر لپیٹا ہوا تھا۔ عمر پختہ تھی۔ لیکن چہرہ میک اپ کے بغیر بھی دمکتا تھا۔ عینک نے عمر بڑھانے کے بجائے کم کر رکھی تھی۔

کارڈ پکڑ کر اس نے ایک طرف رکھ دیا۔ پوچھا۔ کیا پیو گے؟۔ ہم نے 'مہربانی' کہہ کر ہاتھ جوڑ دیئے تو بھی اس نے اِنٹر کوم پر کچھ کہا تو نوکر 'بہادر' نے شربت کے دو گلاس لا کر ہمارے آگے رکھ دیئے اور تیلا گلاس ان کے آگے۔

شربت کا گھونٹ بھرتے ہوئے اس نے کارڈ دیکھا اور وہی باتیں پوچھنے لگیں جو ہم بوڑھے ڈاکٹر کو لکھوا کر آئے تھے۔ نام، عمر، کام، بیوی، آبا و اجداد، تکلیف کی حالت، درد کا گھٹنا بڑھنا... پھر جب اس نے پوچھا کہ زندگی کا وہ خوشگوار واقعہ بتاؤ جو آپ کو بار بار یاد آتا ہو؟ تو مجھے ایک بھی یاد نہ آیا۔ اپنی اس حالت پر میں خود بھی حیران ہو گیا۔ ایسے بہت سے واقعات ہوں گے مگر کسی نے اتنا بڑا سکھ دیا ہو، فیصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ ایسے لگا جیسے سکھ اور لطف میری زندگی کا حصّہ نہیں رہا ہو۔ گھبراہٹ میں میں شربت پینے لگا۔ ڈاکٹر نے سمجھایا... "کوئی پریم پیار، بچے، شادی بیاہ، بچے کا جنم، ترقی، انعام، عزت افزائی...؟" لیکن مجھے تو کوئی بات یاد ہی نہیں آ رہی تھی۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر پوچھا "اجازت ہو تو سگریٹ پی لوں؟"...

"ضرور..." کہہ کر اس نے اپنے نزدیک پڑا ایش ٹرے اٹھا کر میری طرف کھسکا دیا۔

اس کی اس حرکت سے میں جذباتی ہو گیا۔ آنکھیں بھیگ گئیں۔ آنسو روکتے ہوئے میں نے ہنس کر کہا" خوشی کا ایک پل تو آپ یہ لکھ لیں... میں تو ڈاکٹر کے پاس آیا تھا... آپ تو کچھ اور ہی نکلے" یہ کہہ کر سگریٹ سلگا کر آنسو سکھا لیے۔

وہ ذرا کھل کر مسکرائی تو اس کے چہرے پر پڑی عمر کی سلوٹیں کھل گئیں۔ سرخی آ گئی۔ اس نے پین رکھ کر نیچے کو جھکا ساڑھی کا پلّو پھر کندھے پر لپیٹ لیا۔ اس میں کوئی بھی بات ولائت میں تعلیم حاصل کرنے اور پھر پریکٹس کرنے والی نہیں تھی۔ وہ بات کرتی ہوئی نہ تو کندھوں اور آنکھوں کو حرکت میں لاتی تھی اور نہ ہی ہاتھ اور سر ہلاتی تھی۔ انگریزی کی جگہ سادہ سی پنجابی بولتی تھی۔ وہ بھی کھنہ یا نواں شہر جیسے چھوٹے شہر والی۔

جب اس نے میری تکلیف کے بارے میں پوچھا تو میں ماہرین کی طرح ہوشیار ہو کر بتلانے لگا۔ درد کہاں ہوتا ہے؟ کب ہوتا ہے؟ کیسے گھٹتا، بڑھتا ہے۔ پھر میں کیا کرتا ہوں..." بیوی سر میں تیل سے مالش کرتی ہے۔ بیٹے ٹانگیں دباتے ہیں۔ پھر بھی رات کو نیند نہیں آتی۔ اُٹھ کر بیٹھ جاتا ہوں تو بھی نیند نہیں آتی۔ گولی کھاتا ہوں تو بھی ٹکڑا ٹکڑا کرکے آتی ہے... ہاں بیوی بہت نیک اور بچّے فرمانبردار ہیں۔ بڑا لائق نکلا۔ بنک میں لگ گیا۔ ساری تنخواہ لا کر ماں کو دیتا ہے۔ چھوٹے نے بمشکل بی اے کیا۔ شعر کہتا ہے۔ عارضی کلرک ہے۔ آدھی تنخواہ وہ بھی دے دیتا ہے۔ مجھے شراب کا پیگ بنا کر دیتا ہے۔ شاعری سناتا ہے۔ میں بھی شعر کہا کرتا تھا، کالج کے زمانے میں۔ مگر ہماری شاعری سیدھی ہوا کرتی تھی۔ اس زمانے کے شاعر اُلجھی اُلجھی سی باتیں کرتے ہیں۔"

"آپ کو خواب آتے ہیں؟"

"ہاں جی... کہیں ایک دو... بس آتے ہی رہتے ہیں۔ پتہ ہی نہیں چلتا کہ جو کچھ دیکھا خواب میں تھا یا بیداری میں۔"

"کوئی وہ خواب بتائیں جو بار بار آتا ہو؟"

"ایک تو جی میں خواب میں راستے بھول جاتا ہوں۔ اس گلی کا، اس گھر کا، جہاں میں نے جانا ہوتا ہے، وہ وہاں نہیں ہوتا ہے۔ کوئی اور ہوتا ہے۔ اس کی شکل بدل جاتی ہے۔

آدمی جانور بن جاتے ہیں۔ وہ زمین پر رینگنے لگتے ہیں یا خونخوار جانور بن کر کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ مَیں ڈرتا ہوا بھاگ کر جہاں جاتا ہوں وہ کوئی محفوظ یا اچھی جگہ نہیں ہوتی، بوچڑ خانے سے ہوتے ہیں۔"

"آدمیوں کی شکلیں کیسے بدلتی ہیں؟"

"بس جی... آپ چھلاوا سمجھیں۔ شکلیں بدلتی ہی رہتی ہیں۔ وہ ایسے جانور کی شکل بھی بنا لیتا ہے جو میں نے کبھی دیکھے بھی نہیں۔ تصوّر تک نہیں کیا ہوتا۔"

تبھی کپور بول پڑا۔ "اب وہ بھی بتا دے۔"

میں نے جھنجھلا کر کہا "تو چپ رہ۔ اس کو جی باہر بھیج دیں۔"

ڈاکٹر کے اشارے پر وہ باہر چلا گیا۔ ڈاکٹر شکنتلا ایک منٹ سوچتی رہی۔ پھر کارڈ کی طرف دیکھتے ہوئے پین انگلیوں میں گھماتے ہوئے پوچھا "کوئی وہ بات بتائیں، جو آپ کے تصوّر میں آتی ہو۔ من کو سکھ دیتی ہو۔

"وہ تو جی کئی ہیں، پر سوچ کی پکڑ میں نہیں آتیں... اُلجھتی، کھُلتی رہتی ہیں۔" کہہ کر میں نے دوسری سگریٹ سلگائی۔ چپ ہی رہا... پھر اُس کے زور دینے پر اتنا ہی بتا سکا۔ "شہر سے دُور۔ گھر والوں سے دُور کسی نیم پہاڑی جگہ پر کوئی کٹیا سی ہے۔ میں آزادی سے رہ رہا ہوں تمام بندھنوں سے آزاد... اپنی نیند سوتا ہوں، اپنی مرضی سے جاگتا ہوں... قدرت کے ساتھ اس کا حصّہ بن کر جینا... شہر سے کوئی عزیز دوست آئے... کچھ دیر کے لیے ٹھہرے..."

"کون عزیز دوست؟"

"جی، کوئی خاص نہیں... کوئی بھی..."

"آپ کبھی سیر کرنے جاتے ہیں، پہاڑوں، جنگلوں کی طرف؟"

"نہیں جی... تھک جاتا ہوں... ہمت نہیں ہوتی۔"

"کہیں اُجاڑ بیابان جگہ پر جا کر اکیلے... تنہائی میں بیٹھتے ہو؟"

"نہیں... اگر کہیں جا کر بیٹھوں تو ڈر لگنے لگتا ہے۔ دل گھبرانے لگتا ہے... ایک

بات اور بھی ہے۔ جب کبھی میں اکیلا ہوتا ہوں تو مجھے بھرم اور وسوسے تنگ کرنے لگتے ہیں۔ آوازیں سنائی دینے لگتی ہیں۔۔۔۔ جیسے کوئی مرد اور عورت ماہیا گا رہے ہوں یا عورتیں ڈھولک پر سہاگ گا رہی ہوں۔ جس میں بار بار "بنو" یا "بنا"، کہا جاتا ہو ... کبھی آنکھوں کے آگے کوئی ایبسٹریکٹ سی تصویر آجاتی ہے۔ جو پہلے رنگوں میں ہوتی ہے۔ پھر صرف کالے یا سیاہی مائل بھورے رنگ میں۔ پھر صرف کالے دھبے رہ جاتے ہیں۔ وہ تیزی سے نظر کے آگے گھومتے ہیں۔ میں ان کو ایک جگہ پر روکنے کی کوششیں کرتا ہوں۔ مگر وہ ٹکتے نہیں۔ میں ڈر جاتا ہوں...."

"تو پھر بات اور ہے" کہہ کر اس نے انٹرویو بند کر دی۔ پرچی پر تین دوائیاں لکھ کر مجھے پکڑاتے ہوئے کہا "یہ کھاؤ، ایک ہفتے بعد پھر آنا۔"

میں نے باہر آکر پرچی دیکھی۔ وہ دوائیاں میں پہلے بھی کھا چکا تھا۔ دل نے پھٹکارا...

"تجھے کیا خاک آرام آئے گا ... سچی بات تو بتائی ہی نہیں جو بار بار تیرے تصوّر میں آتی ہے ...!"

مجھے چاہیے تو یہ تھا کہ ڈاکٹر شکنتلا کو ساری بات بتا دیتا کہ میرے ذہن میں ایک عورت کی تصویر ہے جس کے بارے میں میں اس بھرم میں ہوں کہ وہ مجھے کبھی ملی تھی۔ یا پھر کبھی کسی جگہ ضرور ملے گی... اب مجھے چیزوں کے رنگ اچھے نہیں لگتے۔ عورتوں کو دیکھنے کے لیے دل نہیں کرتا۔ کبھی کبھی کسی عورت کا چہرہ اچھا لگتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد بُرا لگنے لگتا ہے۔ تصور والا وہ چہرہ کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ جب کبھی میں کوشش کر کے دیکھتا ہوں تو وہ سالم نہیں ملتا۔ بازار میں دکھائی دینے والی عورتوں کے چہروں میں اس کے حصے ٹکڑے ملتے ہیں۔ کہیں ماتھا ہوتا ہے، کہیں ناک، کہیں لب اور کہیں ٹھوڑی ... بہت تردّد کر کے یاد آتا ہے کہ ایسے چہرے والی لڑکی ہمارے کالج میں تھی، اس کا نام شاید نیلما تھا۔ اس نے شاید ہی کبھی میرے ساتھ ایک دو بار بات کی ہوگی ... یہ بات میں نے صرف کیور کو بتائی وہ بھی تب جب وہ اپنے عشق کی باتیں میرے سامنے ناٹک، کے کردار کی طرح ایکٹنگ، کر کے سنا رہا تھا ... اب یہ بات، میں ڈاکٹر شکنتلا کو کیسے بتا سکتا تھا؟... پھر بھی اس نے چار انٹرویوں کے بعد کچھ نہ کچھ پوچھ ہی لیا۔ حالانکہ میں نے اس کے بڑے اُلجھانے والے سوالوں کے جواب، بہت، گول کر کے دیئے تھے۔

ایک دن باتیں کرتے ہوئے اس نے پوچھا "آپ کے تخیل میں کیسی عورت کی تصویر ہے؟"

میں بوکھلا گیا۔ کہا "کوئی خاص نہیں... بس یوں ہی سی... خوبصورت عورتیں اچھی لگتی ہیں۔"

"پھر وہ شکل جو آپ کے تصور میں عام آتی ہو؟"

"بس... جیسے آپ۔" میں کہہ تو گیا پر خود گھبرا گیا۔ پتہ نہیں کس جذبے کے تحت مجھ سے وہ بات کہی گئی تھی... شرم سے اس کا چہرہ لال ہو گیا۔ اس نے تیزی سے قلم چلا کر دو دوائیاں بدل دیں۔ کوئی پرہیز نہیں بتایا۔ کوئی نصیحت نہیں کی... میں باہر آ کر سوچتا رہا کہ یہ مجھ سے کیا ہو گا؟ سوچتے اور خود کلامی کرتے ہوئے مجھے لگا کہ اس میں کچھ سچائی بھی ہے۔ ڈاکٹر شکنتلا کا چہرہ نیلما سے کافی ملتا جلتا ہے۔

کئی ہفتوں کے بعد میں اس کے کلینک گیا۔ اندھیرا ہو گیا تھا۔ چھوٹے کمرے میں ڈاکٹر نہیں تھی۔ میں نے کال بیل کی تو نوکر بہادر نے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر بیٹھنے کو کہا۔ سات آٹھ منٹ کے بعد وہ آئی۔ اس کے چہرہ پر رونق نہیں تھی۔ مسکراہٹ بھی بناوٹی سی لگی۔ میں حیران تھا کہ اتنی امیر ہو کر اور عیش و آرام کی اتنی چیزیں حاصل کر کے بھی وہ دکھی ہے.... میں نے مذاق میں اپنی جیب میں سے کاغذ کا ایک پرزہ نکالا۔ پین کھولا۔ پوچھا۔ "نام، پتہ، عمر، کام، شوہر، بچے، کوئی خاص خواب کوئی تصور جو بار بار آتا ہو...؟"

وہ ہنس دی۔ اپنی کرسی پر بیٹھنے کے بجائے وہ میرے نزدیک ہی بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔ کل ورما صاحب کے ساتھ فرید آباد گئی تھی۔ دلّی گھومتے رہے۔ رشتہ داروں کو ملتے رہے.... میں تو بور ہو جاتی ہوں فضول میں باتیں سنتے سنتے... ان کے بزنس کنسرن ہیں۔ جس سے بھی ملنا، بس یہی باتیں... کہ کاروبار کس طرح پھیلایا جائے۔ کالا دھن کیسے سفید کیا جائے۔ انکم ٹیکس سے کیسے بچا جائے... ایک بیٹی تھی گھر میں، شادی کر دی۔ امریکہ چلی گئی۔ خوش ہے۔ دونوں ڈاکٹر ہیں... یہ پتہ نہیں کس کے لیے اتنا دھن اکٹھا کر رہے ہیں... یہ بھی ایک ذہنی بیماری ہے۔ پیسہ، پیسہ، اور پیسہ۔"

"معاف کرنا، میں نے یہ بات کہی ہی نہیں۔ میں تو پوچھتا ہوں، کیا پیو گے؟ ٹھنڈا یا گرم؟... بہادر ایک گلاس شربت لا کر رکھو ان کے آگے۔"

اس نے 'سوری' کہہ کر فروٹ جوس کے دو گلاس منگوائے۔ میں نے کہا "اگر آپ مریضوں

پر اتنا خرچ کرتے رہے، پھر چل لیا آپ کا کلینک ... فیس آپ ایک ہی بار لیتے ہیں ...''

کہنے لگی۔ ''موہن جی۔ اپنی اپنی دماغی بیماریاں ہیں۔ یہ میری سمجھ لو ... ویسے میں کچھ لوگوں سے فیس کئی بار لیتی ہوں''۔

''آپ بھی بیمار ہو سکتے ہیں؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''ہاں، کیوں نہیں ... ویسے تو دنیا کے نوّے فی صد لوگ دماغی بیماریوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ مگر وہ مانتے نہیں۔ ہمارے جیسے غریب ملک میں بیماریاں اس وقت تک چھپا کر رکھی جاتی ہیں جب تک بیمار کھانے پینے یا ٹھیک سوچنے سے بالکل بے کار نہ ہو جائے''۔

ہم نے جوس کے گلاس اٹھائے۔ شراب کے پیگوں کی طرح لہرا کر، ٹکرا کر اس نے کہا ''آپ کی صحت کے نام''۔ میں نے اسے بتایا کہ درد کم ہوئے ہیں، نیند بھی آجاتی ہے۔ پانچ چھ گھنٹے کہنے لگی۔ میں بھی اتنا ہی سوتی ہوں۔ اتنی کافی ہے۔ اس کے بارے میں سوچنے کی ضرورت نہیں۔ دوائی ذرا کم کر دو۔ جب کبھی ضرورت پڑے، مشورہ کرنے آجایا کرو''۔

میں باہر آیا تو لگا کہ میں تو پوری طرح ٹھیک ہوں۔ پیدل گھر تک گیا۔ تھکاوٹ نہیں ہوئی۔ رات کو پیٹ بھر کر کھایا۔ ٹانگیں دبوانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ پڑھتا رہا۔ پڑھتا پڑھتا سو گیا۔ مگر کسی روز دفتر سے گھر آکر طبیعت کچی کچی سی ہو جاتی ہے۔ دل کہتا، دو پیگ لے لوں، روٹی اچھی کھائی جائے گی۔ نیند اچھی آئے گی۔

چار ہفتوں کے بعد ایک ایتوار کو بیٹے نے آکر بتایا کہ کوئی مجھے پڑوسیوں کے ٹیلی فون پر بلا رہا ہے۔

ڈاکٹر شکنتلا ورماتھی۔ پہلے میری طبیعت کے بارے میں پوچھا۔ پھر ہدایت کی کہ دس بجے بس اسٹینڈ کے پچھلے گیٹ پہ پہنچ جاؤں۔ کہیں جانا ہے۔ شام کو لوٹ آئیں گے۔

میں نے بیوی کو کسی اور کا نام لے کر بتایا کہ کہیں جانے کو کہتا ہے، سیر کرنے کے لیے۔ وہ خوش ہوئی کہ میری طبیعت بہل جائے گی۔ اس نے میرا بیگ خود تیار کیا۔ نہانے کے لیے پانی گرم کر دیا۔ چلنے لگا تو بیوی نے تاکید کی ''دوائیاں بیگ میں ڈال دی ہیں۔ کھانا نہ بھولنا۔ کسی کے ساتھ بیٹھ کر زیادہ پی نہ لینا۔ اندھیرا ہونے سے پہلے گھر لوٹ آنا جی''۔

بس اسٹینڈ کے پچھلے گیٹ پر پورے دس بجے ڈاکٹر شکنتلا کی کار آگئی۔ اس نے اگلا دروازہ کھول دیا۔ ساتھ بیٹھ کر میں نے پوچھا "کہاں جانا ہے؟" اس نے مسکراتے ہوئے کہا "پتہ نہیں"۔ اور کار کالکا والی سڑک پر دوڑنے لگی۔ راستہ میں ہم مشرقی اور مغربی رسموں، رواجوں اور قدروں قیمتوں کی باتیں کرتے رہے۔ راستہ میں پہاڑی چڑھائی اور اُترائی آنے لگی تو وہ پنجاب کے بدلتے موسموں، درختوں، پھولوں کے رنگوں اور سورج کے طلوع و غروب ہونے کے وقت آسمان کے بدلتے رنگوں کی باتیں کرنے لگی۔ جب اس نے کیکر کے پتوں۔ کیکر کے پھولوں، نیم کے پھولوں اور پکی نمولیوں کی مہک کی بات کی تو میں حیران رہ گیا۔ آدھی عمر ولایت میں گزارنے والی کو دیس کی کتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کا علم تھا۔ خود کو رنگوں اور خوشبوؤں کے بارے میں اتھارٹی سمجھنے والا میں اس وقت ادنیٰ سا ہو گیا جب اس نے چنے اور دھان کے کھیتوں کی مہک اور فصل کے بدلتے ہوئے رنگوں کی بات کی پھر اس نے مجھے یہ بتا کر ڈرا ہی دیا کہ وہ کسی بھی شخص کی پسند کے رنگوں اور خوشبوؤں کو جان کر اس کی شخصیت کو سمجھ لیتی ہے۔

پھر پتہ نہیں کیا ہوا کہ میری طبیعت گھبرانے لگی۔ ایک جگہ رک کر ہم نے جوس پیا۔ میں نے ایک سگریٹ پیا۔ اور ہم تازہ دم ہو کر چل پڑے۔

ڈیڑھ ایک گھنٹے کے سفر کے بعد ہم ایک طرف سڑک سے ہٹ کر بنے ریسٹ ہاؤس کے آگے تھے۔ کمرہ اس نے پہلے سے بُک کرا رکھا تھا۔ اس نے اپنا پورا نام اور میرا نام و پتا ایک مریض کے طور پر لکھوا دیا تھا۔

کمرے میں بیٹھ کر ہم نے ناشتہ کیا۔ تھرمس کی چائے پی۔ میں نے بیڈ پر لیٹ کر سگریٹ پیتے ہوئے کمر ذرا سیدھی کی۔ پھر ہم چھدرے سے پہاڑی جنگل میں درختوں، پرندوں اور جانوروں کو پرکھتے پہچانتے اونچی نیچی پگڈنڈیوں پر چلتے رہے۔ چھوٹے بڑے نالے پھاندتے رہے۔ تھکاوٹ بالکل نہیں ہوئی۔ ایک درخت کو دیکھ کر وہ کھڑی ہو گئی۔ اس کے پتّے جھالروں جیسے تھے۔ پھول بھی ٹہنیوں کے سِروں پر جھومروں کی طرح لٹک رہے تھے۔ اس نے میری طرف دیکھ کر کہا "اگر ہم یہ پھول اُتار سکیں!"۔ میں نے کہا "یہ کون سی بڑی بات ہے۔ میں ابھی اُتار لاتا

ہوں ...،، میں نے بوٹ اُتار ے۔ اور درخت پر چڑھنے لگا۔ لیکن دوسری یا تیسری جگہ پیر جمنے کے بجائے پھسل گیا۔ جب پھر پھسلنے لگا تو اس نے میرے پاؤں کے نیچے اپنا ہاتھ لگا دیا۔ میرا اگلا قدم ٹوٹی ٹہنی پر تھم گیا۔ میں نے پھولوں کے کئی گچھے اُتار کر نیچے پھینکے۔ جو اس نے اپنی ساڑھی کے پلّو میں دبوچ لیے۔

میں اترنے لگا تو اس نے پھر ہاتھ کا سہارا دینا چاہا جس کی مجھے شرم آئی۔ میں نے ایک طرف ہو کر چھلانگ لگا دی۔ جس سے میرا دل بری طرح دھڑک گیا۔ مگر یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس کا چہرہ چمک گیا تھا۔

کمرے میں بیڈ پر لیٹ کر میں سگریٹ پینے لگا تو مجھے لگا کہ میں تھک گیا ہوں۔ دل کی دھڑکن بے قابو ہوتی جاتی ہے۔ پہلے درخت پر چڑھ کر اور پھر چھلانگ لگا کر میں نے حماقت کی ہے۔ دل کی وہ کون سی حالت تھی کہ میں اپنے جسم اور دل کی اوقات بھول گیا تھا؟...

اب یہ بات ڈاکٹر کو بتانے سے شرم آتی تھی۔ سوچا نہالوں تو شاید طبیعت سنبھل جائے۔

میں نہا کر جسم کو ڈھیلا چھوڑ کر آرام کرنے لگا۔ ڈاکٹر خود نہانے چلی گئی۔ نہا کر آئی تو اس کا چہرہ صاف ستھرا اور نکھرا ہوا تھا۔ لیکن بوڑھا لگتا تھا۔ عینک کے بغیر اس کی آنکھوں کے ارد گرد کی جھرّیاں اُسے اور بھی بوڑھی بنا رہی تھیں۔ میرے سامنے بیٹھ کر وہ بال سنوارتی رہی۔ میں کبھی آنکھیں کھول لیتا اور کبھی بند کر لیتا۔ صحت ٹھیک نہ ہو تو مجھے اچھی شکل بھی بری لگتی ہے۔

اچانک اس نے کنگھی روک کر پوچھا ”اس کو آپ کب سے جانتے تھے؟“

”کسے؟“ میں نے ہڑبڑا کر پوچھا۔

”نیلما کو“ پھر اس نے مدھم سی آواز میں بتایا ”مجھے کپور صاحب نے سب کچھ بتا دیا ہے... آپ نے چھپانے کی بہت کوشش کی۔ مگر آپ کو پتہ ہی نہیں چلا کہ آپ خود مجھے اس کے بارے میں اشارے دیتے رہے ہو۔ ایک بار آپ نے نام بھی لیا تھا۔ اب آپ بھول گئے ہیں۔ آپ کی کیس ہسٹری میں سب کچھ لکھا پڑا ہے۔“

میں ایک دم ڈر گیا۔ مجھے لگا کہ میں اس اجنبی عورت کے سامنے ننگا ہو گیا ہوں۔ مجھے شرمساری اور جھینپ نے دبا لیا... ٹانگوں کا درد سر میں آنے لگا۔ کوئی لہر سی میری کھوپڑی کے پچھلے

حصے میں سے اٹھتی اور ریڑھ کی ہڈی میں سے ہوتی ہوئی ایڑیوں تک چلی جاتی۔ جب آہستہ آہستہ پیروں کے تلوں میں سے نکلتی تو دل کو جیسے کوئی مروڑ دیتا ... تبھی سر پر پسینہ آجاتا۔ دل ڈوبنے لگتا۔

میں بے بسی میں ڈاکٹر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے بالوں کو جھٹکا سا دے کر ایک طرف کر لیا۔ اٹھ کر دروازے کی بولٹ بند کر دی۔ آئینے کے آگے کھڑی ہو کر ہلکا سا میک اپ کیا۔ میرے پاس کرسی پر بیٹھتے ہوئے میرے سرہانے سے ڈبیا اٹھا کر ایک سگریٹ سلگائی۔ پھر ایک لمبا کش لے کر کہنے لگی "وہ آپ کو یاد ہیں ... کالج کے وہ دن؟ ... بسنت فیسٹول میں آپ نے ایک نظم سنائی تھی۔ جس کی آپ کو بہت داد ملی تھی۔"

"ہوں۔" میں نے یاد کرتے ہوئے کہا۔

"آپ جب ہال سے باہر نکلے تھے تو ایک لڑکی نے آپ کو مبارک باد دی تھی انعام ملنے پر ... وہ میں تھی۔" کہہ کر اس نے مجھے تعریفی نظروں سے دیکھا۔

مجھے صرف نظم پڑھنے والی بات یاد تھی۔ اور کچھ نہیں۔ میں نے اس شکل کی لڑکی کو پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ عمر میں مجھ سے کافی چھوٹی لگتی تھی۔ بڑی بات تو یہ کہ وہ میرے شہر کی تھی ہی نہیں ... پھر بھی میں نے کہا۔

"اچھا جی۔" اور اس کی طرف حیرانی سے دیکھا۔ اب وہ خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ مگر میں سگریٹ پی رہی اس عورت کے چہرے کو دیکھ کر لطف اٹھانے کے قابل نہیں تھا۔ صحت مند ہوتا تو دیکھ کر پاگل ہو جاتا ... یہ بات مجھ سے ڈاکٹر شکنتلا کو اس وقت بتائی گئی تھی جب اس نے پوچھا تھا "آپ کو عورت کا کون سا روپ پسند ہے؟ ..."

آخر کار میں نے اسے کہہ دیا "میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ دل گھبرا رہا ہے۔"

"بس۔ اتنی سی بات سن کر؟" کہہ کر وہ میری طرف دیکھتی رہی۔ مجھے لگا کہ اسے کوئی مغالطہ ہوا ہے۔ لیکن میں اسے سمجھانے کے قابل نہیں تھا ... پھر میرا چہرہ شاید زرد پڑنے لگا تھا ... یا وہ اپنے آپ میں لوٹ آئی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھی۔ اپنے بیگ میں سے سفید سی دوا نکالی۔ چند قطرے پانی میں ملا کر مجھے پلا دیئے۔ اس کا ذائقہ بُرا سا اور بُو تیز تھی۔

اس نے میرا بازو سہلاتے ہوئے کہا۔ ”آپ آرام کریں۔ سو جائیں۔ اُٹھو گے تو ہلکے ہلکے محسوس کرو گے۔“

کچھ دیر بعد میں ٹکٹکی باندھے ڈاکٹر کو دیکھے جا رہا تھا۔ مجھے ڈاکٹر اور نیلما کے چہروں کے نقوش گڈمڈ ہوتے دکھائی دینے لگے۔ پھر وہی مغالطے سے ہونے لگے۔ آوازیں سنائی دینے لگیں۔ جیسے کوئی مرد اور عورت مل کر پہاڑی ماہیا گا رہے ہوں... یا دور کہیں لڑکیاں ڈھولک پر سہاگ گا رہی ہوں۔ میں نے پوچھا۔ ”یہ ماہیا کون گا رہا ہے؟“

اس نے اُٹھ کر اپنے تولیئے یا ساڑھی کے پلّو سے میرے ماتھے کا پسینہ پونچھ دیا اور کہا ”یہ میں گا رہی تھی۔ آپ سو جایئے۔“

مجھے لگا کہ میں آدھا سویا اور آدھا جاگا سا ہوں۔ خواب دیکھ رہا ہوں۔ نیلما میرے سرہانے کھڑی ہے۔ بال بکھرے ہوئے ہیں۔ چہرے پر تھکاوٹ ہے۔ میں پوچھتا ہوں ”نیلما، تو یہاں کیسے؟...؟“

”صبح سے تمہیں تلاش کرتی یہاں آئی ہوں۔“ اس نے میرے چہرے پر جھکتے ہوئے کہا مجھے لگا، میری جان گھٹتی جا رہی ہے۔ جسم میں طاقت نہیں کہ اُسے چھولوں۔ یا بیٹھنے کو کہوں۔ بس لگاتار دیکھے جا رہا ہوں۔

”تو نے مجھے بلایا تھا نا؟... میں آگئی۔“ کہہ کر وہ ماتھے کے بالوں پر ہاتھ پھیرتی ہے۔ اس کی سانس تیز چل رہی ہے۔ مجھے لگتا ہے، وہ کہیں سے بھاگ کر آئی ہے۔ میں پوری طاقت لگا کر بول کر اسے بتاتا ہوں ”مجھے اسی پل کا انتظار تھا۔ بس، آخری خواہش۔ اب میرا مرنا آسان ہو جائے گا۔“

”تجھے کون مار سکتا ہے، جب میں تمہارے پاس ہوں۔“ کہہ کر وہ اپنے بازو پھیلاتی ہے۔ ساڑھی کے پلّوؤں کے پَر بنا لیتی ہے اور میرے سارے وجود کو اپنی بانہوں، چہرے اور بالوں سے ڈھک لیتی ہے۔ اس کے جسم کی حرارت میرے بدن کی ٹھنڈک کو کم کر دیتی ہے۔ دل پُرسکون، ٹھہرا ہوا اور پھر ہوش سے دور ہونے لگتا ہے۔ نیند آ جاتی ہے۔

آنکھ کھلی تو ڈاکٹر شکنتلا سامان باندھ کر جانے کو تیار بیٹھی تھی۔ کھلتی اور بند ہوتی ہوئی

آنکھوں کو دیکھ کر اس نے کہا "لو، ایک کپ چائے پی لو۔"

میں کافی تردّد سے اُٹھ کر سرہانے کے اوپر کو ہو گیا۔ اس نے پیٹھ کو ذرا سہارا دے کر پیالہ پکڑا دیا۔ چائے پی کر میری آنکھیں کھُل گئیں۔ مگر اُٹھا تو ٹانگیں سیدھی نہیں ہو رہی تھیں۔ وہ سہارا دے کر مجھے کار تک لے گئی۔

تھوڑی دُور جا کر مجھے پھر بھرم ہونے لگا۔ مجھے اپنے کپڑوں میں سے بُو آنے لگی۔ جیسی نیم بے ہوشی کی حالت میں نیلما سے آتی تھی۔ کبھی کبھی ہوا کے جھونکے کے ساتھ ڈاکٹر کی طرف سے بھی آتی۔ جب ہم گئے تھے تو کوئی خوشبو نہیں تھی۔ پیلے پھولوں کے گُچھے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر پڑے تھے۔ ان کی خوشبو کچھ اور ہی طرح کی، کچی کچی سی تھی۔

اپنے "آلو" بننے کے ڈر سے میں بولا نہیں۔ ایک بار جھٹکا لگنے کے بہانے میں ڈاکٹر کے نزدیک ہو گیا تو بات پکّی ہو گئی۔ وہ میرا وہم نہیں تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ میری حرکتیں نوٹ کر رہی ہے تو میں ایک طرف کو ہو کر کھڑکی کے شیشے میں سے باہر دیکھنے لگا۔

اچانک میری نظر ایک بال پر پڑی، جو میری قمیض کے بٹن میں پھنس کر چپکا ہوا تھا۔ اسے دیکھنے کے بعد میں نے ڈاکٹر کی طرف نہیں دیکھا اور نہ ہی بال کو ہاتھ لگایا۔ ویسے چوری چوری اپنا دایاں ہاتھ ناک کے نزدیک کر کے سونگھا۔ اس میں سے بھی خوشبو آ رہی تھی، مگر کسی اور طرح کی۔

"آپ کو سنگیت کا شوق ہے نا؟" اس نے پتہ نہیں میری حرکت نوٹ کر کے یا خاموشی کو توڑنے کے لیے پوچھا۔

"ہے تو سہی، مگر صرف بھارتی اور پنجابی لوک دھنوں کا۔"

"جو گیت آپ کو خود بخود نج کر سُننے لگتا ہے، وہی سُنا دوں؟" کہہ کر اس نے میرے جواب کا انتظار کیے بغیر ٹیپ ریکارڈر پر کیسٹ چڑھا دی۔ وہ پاکستانی لوک گائکوں کی رنگا رنگ آوازوں اور دھنوں میں گایا گیا ماہیا تھا۔ ریکارڈنگ انگلینڈ کی تھی، ایکو والی۔

پہلے ماہیا اور پھر ہیر سنتے جب ہم فتح گڑھ میں داخل ہوئے تو اندھیرا ہو گیا تھا۔

اُس نے کار میرے گھر والی لین کے موڑ پر آم کے اندھیرے میں روک دی۔ تیزی سے

اُتر کر میری طرف کا دروازہ کھولا۔ میں دھرتی پر پاؤں جماتا باہر نکلا۔ اس نے میرا بیگ میرے کندھے پر ٹکایا۔ میرا ہاتھ دبایا۔ اندر کو جا رہی سانس کے ساتھ کہا۔ ''اچھا۔ الوداع'' اور تیزی سے کار اسٹارٹ کر کے اُڑ گئی۔

گھر پہنچا تو جسم ٹھیک تھا، مگر دماغ میں دھواں سا کچھ تھا۔ بیگ رکھ کر لیٹا تو میرے کپڑوں میں کوئی خوشبو نہیں تھی۔ ہاتھ میں بھی نہیں تھی۔

سال بھر شکنتلا کی طرف سے ہر تہوار پر مبارکبادی کارڈ آتے رہے جن میں میری صحت کے لیے پرارتھنا کی گئی ہوتی۔ لیکن کسی پر بھی اس کا اپنا پتہ نہیں ہوتا تھا۔ صرف دستخط ہوتے تھے۔

اس بات کو بارہ برس بیت چکے ہیں۔ میں ریٹائر ہو چکا ہوں۔ کوئی دوائی نہیں کھاتا۔ پیٹ بھر کر کھاتا ہوں۔ جی بھر کر سوتا ہوں۔ ۔۔۔ البتہ کبھی کبھی یہ بات دل پر بوجھ سا ڈال دیتی ہے کہ اسے انگلینڈ نہیں چلا جانا چاہیے تھا۔

اُلجھن

جے کے نے دفتر سے آکر اپنے کمرے کا دروازہ کھولا۔ اندر چِھٹّی پڑی تھی۔ اس نے کھڑے کھڑے ہی لفافہ کھولا۔ کھڑکی کی روشنی میں جاکر چِھٹّی پڑھی ... وجیتا کی تھی۔ اس نے دو باتیں ہی لکھی تھیں ... 'میں اُلجھن میں ہوں۔ دل میں ایک گانٹھ سی بنی پڑی ہے ... آپ کے روبرو ایک اعترافِ گناہ کرنا چاہتی ہوں ... میں اس بدھ کی صبح کے گیارہ بجے آؤں گی۔ گھر پر ہی رہنا۔ پھر میں نے جلدی لوٹ جانا ہے'۔

جے کے نے اپنا کوٹ اُتار کر بیڈ پر پھینک دیا۔ کُرسی پر سے کتابیں اُٹھا کر میز پر لگے ڈھیر پر رکھ دیں۔ تسمے کھولے بغیر ہی بوٹ اُتار پھینکے۔ فرش پر دھول جمی تھی۔ اس نے پاؤں مُوڑوں پر رکھ لیے۔ کوٹ کی جیب میں سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ میز کی دراز کھول کر ماچس تلاش کی۔ اور کرسی پر بیٹھ کر ٹانگیں بیڈ پہ رکھ کر سگریٹ پینے لگا۔

اس نے چِھٹّی ایک بار پھر پڑھی ... وجیتا، وجیتا، وجیتا ... اس نے کئی بار پڑھا۔ اس کے لکھے ہوئے الفاظ کی بناوٹ دیکھتا رہا ... ان میں اسے نہ کوئی جلد بازی دکھائی دی اور نہ ہی کوئی گانٹھ۔ تحریر اس طرح کی صاف تھی اور مروڑیاں فن کاروں جیسی تھیں۔ پین کی نب بھی ویسی ہی تھی، جس کے ساتھ کبھی وہ ایک چِٹ لکھ کر اس کو بھیجا کرتی تھی ... 'آج چائے نہیں پلاؤ گے؟' ... نیچے دستخط کی جگہ ایک چڑی کی شکل بنائی ہوتی تھی۔ جسے پڑھ کر جے کے یہ سمجھ نہیں پاتا تھا کہ وجیتا وہ چائے شام کو اس کے کمرے میں آکر پینا چاہتی ہے یا چُھٹّی کے بعد کسی ریسورینٹ میں بیٹھ کر یا ابھی دفتر کی کینٹین میں بیٹھ کر؟ ... (وہ یہ چائے مانگ کس دعوے سے رہی ہے؟ ... کہیں مجھے اُلّو تو نہیں بنا رہی۔ نا امید شخص سمجھ کر؟)

سگریٹ کا گُل چِھٹّی پر آگرا تو وہ جلدی سے سیپ اور میٹل سے بنا وہ ایش ٹرے تلاش کرنے لگا جو اس کو وجیتا نے دیا تھا۔ 'مجھے لگا اس کمرے کو اس کی ضرورت ہے'... وجیتا نے وہ چمکدار پرندہ سا لفافے میں سے نکال کر میز پر رکھتے ہوئے ہنس کر کہا تھا... کاش یہ بات شششی کو سوجھی ہوتی کہ اس کمرے کو اس کی کتنی ضرورت تھی۔ وہ سال بھر بات پکّی کراتے کراتے دِلّی جا کر شادی کرا کے بیٹھ گئی تھی... (پتہ نہیں اُسے ہوٹل کے اُس مالک میں کیا دکھائی دے گیا تھا۔ امیر ہونا الگ بات ہے، مگر دل کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔)

زندگی میں کِس چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ کِس کِس کی نہیں؟ سوچتے ہوئے جے کے نے کمرے کا جائزہ لیا۔ ہر چیز اپنی جگہ سے اُکھڑی اور بِکھری سی لگتی تھی۔ بستر کی چادریں سِلوٹیں پڑی تھیں۔ ریکارڈ پلیئر کے اوپر گرد جمی ہوئی تھی۔ ریکارڈ اپنے اسٹینڈ سے باہر اُلجھے سے پڑے تھے۔... (سچ بات تو یہ ہے کہ جب کوئی شخص تھک جاتا ہے تو بکھر جاتا ہے...؟... کون تھک گیا؟... جے کے؟... نہیں، بالکل نہیں... نہ سہی۔ مگر کبھی کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ دل خالی خالی ہو گیا ہے۔ کسی کے ساتھ تعلق ہونے کا احساس ہی نہیں رہتا۔ یہ بوٹ، یہ کپڑے، یہ جسم، یہ کمرہ، دفتر کے ساتھی، دِلّی میں چھوٹے بھائی کے پاس رہتی ماں، بھائی، بھتیجے... کسی کے ساتھ بھی نہیں۔ یہ دل اس طرح کیوں ہو جاتا ہے، بانجھ سا۔ کسی بھی چیز کو، فرد کو قبول کرنے سے مُنکر۔)

اس نے چِھٹّی ایک بار پھر پڑھی۔ بند کر کے میز پر رکھ دی... کاہے کی گانٹھ؟ کاہے کا کنفیشن؟... ہو سکتا ہے، ہو سکتا ہے، وہ کسی کے ساتھ شادی کرنے کے لیے مجھ سے مشورہ کرنا چاہتی ہو۔ کوئی رکاوٹ ہو۔ مگر کنفیشن کاہے کا؟)... اس نے سگریٹ کا آخری کش لے کر ایش ٹرے میں مروڑ دیا اور اُٹھ کر چائے بنانے لگ گیا۔

ایک برس ہو گیا تھا وجیتا کو یہاں سے ٹرانفسر ہو کر گئی کو۔ اس نے کوئی خط نہیں تھا لکھا۔ بس آخری ملاقات بھی الوداعی دعوت میں ہوئی تھی۔ وجیتا نے اس کو بھی دیگر اسٹاف ممبروں کے ساتھ ہی نمستے کہی تھی۔ اور ٹرانسفر ہو کر جانے والے دوسرے ملازمین کی طرح اداس سا چہرہ لے کر چلی گئی تھی... (اس نے چائے کے لیے بھی کوئی چِٹ نہیں تھی بھیجی۔ حالانکہ فاصلہ

کتنا تھا دونوں شہروں کے درمیان ؟ صرف دو سو کلومیٹر کا یا کچھ روپے کرائے کا یا جیسے کہ بزرگ کہتے ہیں کہ سسرا پندرہ پیسوں کا پوسٹ کارڈ...)

کھڑے ہو کر چائے بناتے ہوئے اس کی ٹانگیں جیسے تھک گئی تھیں۔ اس نے نظروں سے پیمائش کی۔ (اسٹول کتنا اونچا ہونا چاہیے۔)

جے کے نے چائے کا کپ ہاتھ میں پکڑ کر محسوس کیا، موسم کافی بدل گیا ہے۔ گرمی محسوس ہونے لگی ہے۔ جرّابوں میں اس کے پاؤں گرم ہو گئے تھے (ششی کو عاشق، دوست اور شوہر کے علاوہ کچھ اور بھی چاہیے تھا۔ گھر، سواری، زیورات، چیزیں اور اونچے خاندان کی ڈینگیں ... اور وجیتا کو ؟ ... عورت اور تلوار اس کی ہوتی ہیں جس کے ہاتھ میں ہوں۔ چیز اپنی ہو تب نا ؟ ... عورت کوئی چیز ... ہوتی ہے ؟) ... اسے اپنی عام سوچ پر ہنسی آئی۔ (وجیتا کی سوچ بھی عام سی تھی، میری طرح ؟ ہاں تیری طرح ہی۔ نہیں ؟)

وجیتا اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس نے اپنی ٹھوڑی اپنے ہاتھ پر ٹکا رکھی تھی اور اپنی کہنی میز پر۔ کھلے بال میز کو چھو رہے تھے اور نظریں جے کے کے چہرے پر تھیں ... جے کے کی بات حلق میں اٹکی ہوئی تھی۔ اس نے سوچا تھا، وہ وجیتا کی تعریف کرے گا۔ مگر جب بات چلی تو چائے کے ذائقہ اور اس کے چائے بنانے کے طریقوں سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اس سے پہلے جب ان کے درمیان باتیں ختم ہو جاتی تھیں تو وجیتا ششی کی بات چھیڑ لیتی تھی۔ اس وقت ششی کو گئی کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ مگر بعد میں وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے اُکتا جاتے تھے۔ اور محسوس کرنے لگتے تھے کہ جیسے باسی باتیں دہرا رہے ہیں۔ ایک روز وجیتا نے خود ہی کہہ دیا تھا 'ہم کوئی اور بات نہیں کر سکتے ؟'۔ مگر 'کوئی اور بات' ایک دوسرے کو دیکھتے ہی گھُل جاتی تھی ... (وجیتا ہمیشہ اسی طرح میز کی بائیں جانب بیٹھتی تھی، داہنی کہنی میز پر ٹکا کر، ہاتھ پر ٹھوڑی رکھ کر، مجھ پر نظریں ٹکا کر اور منہ میں گھونگنیاں ڈالے ہوئے ... وہ بیٹھی ہوئی خوبصورت لگتی تھی۔ بہت زیادہ تو نہیں۔ بس ٹھیک ٹھیک ہی۔ چہرہ نہ سہی۔ خوبصورتی تو اس کے دیکھنے اور بولنے میں تھی ... وہ میرے کمرے میں کیوں آ جایا کرتی تھی ؟ یونہی، سالی ... میں اس کے انتظار میں کیوں رہتا تھا ؟ کمزوری میری ... اُلجھن میری ... اب اس کی اُلجھن کیا ہے ؟

جے کے آئینے کے آگے کھڑا ہو گیا۔ (کیا یہ بھی اُلجھن ہے؟) اسے اپنے چہرے کے پک جانے کا خیال آیا۔ کنپٹیوں پہ کافی سفیدی آگئی تھی۔ شیو کرنے کو بھی ایک دن چھوٹنے لگا تھا.... اس نے اپنی داہنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ بش شرٹ کا کالر سیدھا کیا۔ اکڑ کر اپنے قد اور چھاتی پھُلا کر اپنی طاقت کا اندازہ لگایا۔ تولیہ اُٹھا کر اپنا چہرہ پونچھا۔ رگڑنے سے چہرے پر آئی سُرخی اچھی لگی.... (اس تولیے سے ایک بار وجیتا نے اپنا چہرہ پونچھا تھا۔ پیسٹری کھانے سے اس کے لب کریم سے لتھڑ گئے تھے۔ تولیے کو کریم کے ساتھ لپ اسٹک بھی لگ گئی تھی... پھر؟ یہ کیا بات ہوئی؟ یہ معمولی سی بات سوچنے کا کیا مطلب؟... آدمی کا اپنے طور پر ہار جانا۔ اپنے آپ میں ٹوٹتا سا محسوس کرنا تو نہیں؟... شرما ٹھیک ہی کہتا ہوتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ آدمی اسٹیل کے برتنوں کے بدلے میں گھِسے پٹے کپڑوں سا پرانا ہو جاتا ہے۔ کیا نہیں؟... بس یہی ثبوت ہے۔ جب دل پر جمتی گرد کی تہہ در تہہ دل پر بوجھ محسوس ہونے لگتی ہے۔)

جے کے نے ایک دم آئینے کی طرف پیٹھ کر لی۔ دوسرے بیڈ پر ریکارڈ بکھرے ہوئے تھے... وہ فیصلہ نہ کر سکا کہ کون سا نغمہ سُنا جائے۔ اس نے دو تین ریکارڈ اِدھر اُدھر کر کے ایک پلیئر پر لگا دیا... راحت علی گا رہا تھا.... 'پھول کھِلے ہیں۔ باغ مہکا ہوا ہے۔ آسمان میں پورا چاند ہے۔ دل میں جوار بھاٹا ہے'... گائک اپنے سُروں سے موسم بہار اور جوار بھاٹے کا احساس دلا رہا تھا۔ اس کی آواز سے ترنگیں اُٹھ رہی تھیں۔ چاند سے ٹکرا ٹکرا کر گرتی تھیں اور چھَپ چھَپ کر کے سمندر کی لہروں پر بکھر جاتی تھیں۔ سُروں کا یہ عمل اس کے شعور کو سُلا رہا تھا۔

جے کے نے آنکھیں کھولیں تو اُسے اسی سنگیت، اپنے کمرے کے ماحول اور اپنے دل کی حالت میں بہت زیادہ فرق محسوس ہوا۔ جیسے تینوں باتوں کا آپس میں کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ اس کے کمرے میں تو سیلن جیسی بو تھی اور بے ترتیب چیزوں کا ڈھیر۔ دُھول اور اُمس.... اس نے اپنی جرابیں اُتار دیں۔ بھدّی سی بو نے اسے ایک دم اُٹھا دیا۔ اس نے ریکارڈ پر سے سوئی اُٹھا دی۔ کمرے کی خاموشی کے سکون کو محسوس کرتا ہوا وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ سگریٹ سلگانے لگا۔ مگر ماچس نہ مِلی۔ اس نے جھنجھلا کر میز، بیڈ اور الماری دیکھی۔ جیبوں کو

ایک بار پھر ٹٹولا ۔ جب نہ ہی ملی تو اُٹھ کر باہر چلا گیا۔

• • •

وجیتا نے گیارہ بجے آنا تھا ۔ جے کے ساڑھے نو بجے کھڑکی میں کھڑا باہر دیکھ رہا تھا ۔ وہ صبح کے ساڑھے سات بجے اُٹھا تھا ۔ کتابوں کو قدرے ترتیب میں کرکے میز پر پلیٹ رکھنے کے لیے جگہ بنائی تھی ۔ پھر چائے پی کر سگریٹ سلگا کر بیٹھ گیا تھا ۔ چائے کا ذائقہ اچھا نہیں لگا تھا ... کبھی لگتا کہ چائے پتّی کو اب پہلے کی طرح بلینڈ نہیں کیا جاتا ۔ نہ وہ رنگ، نہ وہ خوشبو ... پتہ نہیں سگریٹ کے تمباکو میں کوئی گڑبڑ ہے ۔ یا زبان کا ذائقہ ہی بگڑا ہوا ہے ۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا ۔ سڑک پر نکل گیا ۔ پار کی گلی میں اپنے دفتر کے ساتھی کے گھر چلا گیا ... دل کیا کہ اُسے چھٹی کی عرضی دے کر اس کے پاس بیٹھ کر دو باتیں کرے ۔ مگر وہ اپنے بچّوں کو پڑھا رہا تھا ۔ عرضی پکڑ کر اس نے ایک طرف رکھ دی ۔ وجہ بھی نہیں پوچھی ۔ ایک بچّے کی کاپی پکڑ کر ٹھیک کرنے لگا ۔

جے کے سڑک پر کھڑا ہو کر آنے جانے والوں کو دیکھتا رہا ۔ (وجیتا اس طرف سے آئے گی ۔ وجیتا کہیں بھی دکھائی نہیں دیتی ... آخر کار وہ کنفیشن کس بات کا کرنا چاہتی ہے ؟ ... ہوسکتا ہے کہ وہ کسی اُلجھن میں پھنس گئی ہو ۔ کسی سے پیار ہو گیا ہو ... ہوسکتا ہے، وہ حمل گرانے کے لیے میری مدد چاہتی ہو ... میں کروں یا نہ کروں ؟ سوچ لو ۔) جے کے نے سگریٹ کا ٹکڑا انگلیوں پر چڑھا کر سڑک کے پار پھینک دیا ۔ اور اپنے کمرے کی طرف چل دیا ... ہاں، میں اب بھی اسے قبول کر سکتا ہوں ۔ حمل گرانے کے بعد بھی ۔ نہ بھی گرائے تو بھی ... جے کے کو اچانک ہنسی آئی، اپنی غیر حقیقی سوچ پر ۔ ابھی بات کا پتہ تک نہیں، وہ فیصلے کیے جا رہا تھا ۔ پھر اُسے اپنے ایک دوست کی بات یاد آئی ۔ اس کی محبوبہ دو برس بعد اس کی مدد اس کام کے لیے لینے آئی تھی کہ وہ اس کی شادی اس کے نئے عاشق سے کروائے ۔ مگر اس نے انکار کر دیا تھا ۔ (میں جواب نہیں دوں گا ۔ دوستی کی حد اتنی کم نہیں ہونی چاہیے ... میں اب چھوٹا تو نہیں ... مگر مگر اس میں عمر کا کیا سوال، مسٹر جے کے ؟)

جے کے نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا ۔ اسٹول کھینچ کر الماری کو لگے آئینے کے آگے

بیٹھ گیا۔ ... سر پر ہاتھ پھیرا تو اسے اپنی کنپٹیوں کے بالوں کے رنگ بدلتے ہوئے اچھے لگے۔ سفیدی اس کے گورے رنگ اور تیکھے تین نقشے والے چہرے کو بھی خوبصورت بنا رہی تھی۔ آنکھوں کا بھورا رنگ کتنا بھلا لگ رہا تھا... یہ بات جے کے کو اچانک نہیں سوجھی تھی۔ وجیتا نے اُسے لگاتار دیکھتے ہوئے اس وقت کہی تھی جب وہ اس کے بارے میں جذبات سے بھرا پُرا اُبھر تا تھا... اس نے تو ایک بار کہا تھا۔ مگر اس نے یہ بات کئی بار سنائی تھی... (بات ٹھیک ہی تھی۔ وجیتا نے جو کہی تھی نا... اس نے کیوں کہی تھی؟ ... مرد کو اُلّو بنانے کے لیے؟ ... رام جانے... وہ طنز یہ باتیں تو کیا کرتی تھی مگر میرے ساتھ نہیں۔ میرے ساتھ تو مذاق کیا تھا، صرف ایک بار اس نے ششی کی طرف سے میرے نام خط لکھا تھا۔ جس میں ششی کی بیتی زندگی کے بارے میں کچھ بتا دیا گیا تھا، جو وہ خود بتانا نہیں چاہتی تھی یا بتانے سے جھجکتی تھی جسے پڑھ کر میں پریشان نہیں ہوا تھا۔ البتہ یہ نہ سمجھ سکا تھا کہ اُسے ضرورت کیا پڑ گئی تھی وہ خط لکھنے کی۔ اس کے تعلقات کسی سے بھی رہے ہوں، مجھے کیا؟ وہ خط وجیتا نے خود لکھا تھا۔ ہمارے درمیان دراڑ پیدا کرنے کے لیے یا ششی نے خود کہہ کر لکھوایا تھا، مجھ سے نجات حاصل کرنے کے لیے، میں اب تک سمجھ نہیں سکا... پہلے ششی اور پھر وجیتا کے چلے جانے کے بعد تو میں نے یہ سوچنا بھی چھوڑ دیا تھا۔)

(پونے گیارہ بج رہے ہیں؟) ... وہ گھڑی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اُتاولا سا ہو گیا۔ کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ (وجیتا سڑک پر آرہی تھی... نہیں وہ کوئی اور تھی۔ تو پھر اس کے پیچھے آرہی وجیتا ہوگی... وہ بھی نہیں... یہ کوئی نئی بات نہیں وجیتا کی۔ وقت دے کر انتظار میں ہلکان کرنا شاید اچھا لگتا ہو اُسے۔ مگر اس طرح ہلکان ہونے سے ڈرتا تھا۔ اسی لیے اسے تنہا رہنا اچھا لگتا تھا۔ اپنے رنگ و رضا میں راضی۔

جے کے کرسی پر بیٹھ گیا۔ دروازے کے پردوں کی دَرز میں سے باہر دیکھنے لگا... کوئی نہیں، کوئی نہیں... کہہ کر اُٹھا اور سب سے آگے پڑا ریکارڈ اٹھا کر پلیئر پر لگا دیا... منّی بائی گا رہی تھی... 'ساون بیتا جائے... انبوا کی ڈالی پہ بولے کوئلیا...')

کتنا اچھا گاتی ہے۔ اس کی آواز، سُر، الفاظ، گلے کی مُرکیاں، لہرا، سارنگی کی گمک، ڈھولک

کی تال ... سب کچھ مل کر تصویریں بناتے ہیں۔ برہن آکر سامنے کھڑی ہو گئی۔ ساون گزر جاتا ہے۔ اس کی جوانی بیتتی جاتی ہے ... پل، پہر، دن، ہفتے اور پھر برسوں کے بیتنے کا احساس۔ ... (چوبیس برس گزر گئے ہیں)

جے کے نے آہ بھرتے ہوئے سانس لی۔ باہر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ ایک دم اُٹھ کر باہر گیا۔ کوئی نہیں تھا۔ وہ لوٹ کر کرسی پر بیٹھ گیا... مُنّی بائی کی تیکھی برہن آواز گائیکی کے ساتھ چہلیں کر رہی تھی۔ جے کے کو طرح طرح کے سُر لگانے کے نخرے بے ہودہ لگے۔ (کیا فضول ہے) کہہ کر اُس نے سوئی اُٹھا دی۔

آواز رکی تو اسے محسوس ہوا کہ وہ کسی گرفت سے آزاد ہو گیا ہے۔ دل کے اندر ہو رہا شور تھم گیا ہے۔ ہاتھوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر سر کو پیچھے کی طرف جھکا کر، ٹانگیں پسار کر وہ کرسی پر لیٹ سا گیا... (مجھے اب کیا کرنا چاہیے؟... انتظار؟... انتظار... ختم نہ ہونے والا دکھ... شمی کہہ گئی تھی، پندرہ نہیں تو بیس دنوں تک میں لوٹ آؤں گی... اب اگر وجیتا اور دس منٹ نہ آئی تو میں باہر چلا جاؤں گا، کوئی شو دیکھنے۔)

"جے کے؟"

"ہاں جی"... وجیتا اس کے سامنے کھڑی تھی، پتہ نہیں کب سے... (ہاں۔ وہی تھی)

"معاف کرنا۔ مجھے ذرا دیر ہو گئی" (بے چارہ جے کے مایوس لگتا ہے۔)

جے کے اُٹھ کھڑا ہوا۔ "بیٹھو... یہاں بیٹھو" کہتے ہوئے اس نے کرسی ذرا آگے کر دی۔ وجیتا تسلّی سے بیٹھ کر کمرے کا جائزہ لینے لگی... (کتنا بدل گیا ہے... سب کچھ بکھرا بکھرا سا پڑا ہے... یہ بیمار تو نہیں؟) اس نے پوچھا نہیں کہ زندگی کی وہ پہلے والی ترتیب کہاں گئی؟

جے کے انتظار کرتا رہا کہ وجیتا پوچھے۔ اور وہ نہ بتائے۔

"چائے بناؤں؟"... (وجیتا نے بال کیوں ترشوا لیے ہیں؟... ٹالپس پہننے لگی ہے۔)

"اچھی سی پتّی ڈال کر۔" (جے کے کی پینٹ کی کریز ٹھیک نہیں۔ بوٹوں پر پالش بھی نہیں۔)

"ٹرین میں آئے ہو؟"... (اس نے کیسری ساڑھی کیوں پہنی ہے، میری پسند کا رنگ۔)

"ہاں۔ ٹرین لیٹ تھی۔" (جے کے بہت سنجیدہ ہو چکا لگتا تھا، مگر سست سا کیوں۔)

(... کیا بات ؟ وجیتا نے کچھ کہا ہے؟) "وچینی کتنی ؟" (پتہ نہیں کس بات کا بوجھ اٹھائے پھرتی ہے دل پر۔ بولتی ہی نہیں۔)

"بس ایک چمچ بھر۔" (جے کے کی آنکھوں میں وہ چمک نہیں۔ بالوں کا اسٹائل بھی بدل گیا ہے۔ آواز بھی؟)

چائے پیتے ہوئے دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ جے کے انتظار میں تھا کہ وجیتا کچھ بولے۔ کچھ بتائے ... کنفیشن۔ اُلجھن کیا ہے ؟... (وجیتا کے کئی بال سفید ہو گئے ہیں۔ مگر خوبصورت لگتی ہے۔ پہلے سے بھی زیادہ ... جسم بھر گیا ہے۔ مگر ملازمت کرنے والی عورتوں کی سی تھکان بھی ہے۔ آنکھوں کے نیچے جُھرّیاں سی پڑ گئی ہیں۔ یہ ہے اس کے شعور کی پختگی۔)

"اوہ، میں بھول ہی گیا۔" کہہ کر جے کے نے اُٹھ کر الماری کھولی اور کیک کے ٹکڑوں سے بھری پلیٹ نکال کر میز پر رکھ دی۔ وجیتا نے بڑی نفاست سے ایک ٹکڑا اُٹھایا۔ کھڑی چھنگلی، ہاتھ کی آدھی اُٹھی ہوئی انگلی، باقی دو انگلیوں اور انگوٹھے کی پکڑ میں لے کر منہ کے ذرا اندر کر کے دانتوں سے کاٹا۔ جے کے کی نظر جو پہلے پلیٹ پر تھی، وجیتا کے ہاتھ تک گئی۔ پھر انگلیوں پر، انگلیوں سے بالوں پر۔ پھر ہاتھ کی پوزیشن دیکھتی چہرے تک گئی۔ منہ، لبوں اور دیگر اعضا کی حرکات دیکھتی رہی ... (وجیتا کا چہرہ بڑا اور بھاری ہو گیا۔ گول تراشے بالوں سے چہرہ گول لگتا ہے۔ بدلتے موسم سے چہرے میں چمک آگئی ہے۔ سکڑی جلد کُھل رہی ہے ... اب یہ پتہ نہیں کیا بتائے گی ؟... دل کرتا ہے اکٹھی لٹوں میں سے دکھائی دے رہے آدھے کان میں پڑے آسمانی رنگ کے ٹاپس اور لال بندی کی تعریف کروں ... مگر اتنے شوخ رنگ کی لپ اسٹک اچھی نہیں لگتی ...)

"کیا حال ہے، دفتر کا ؟... اور سب کا ؟..." وجیتا کچھ بتانا چاہتی ہوئی پوچھتی ہے۔

"ٹھیک ہے،" جے کے نے جیسے مجبوری سے کہا... (یہ کوئی بات ہے پوچھنے والی ؟)

"تمہاری آپ کی پروموشن کیوں رک گئی ؟" (اور کیا پوچھوں ؟ (پھر بھدا سا سوال۔) "بوس کو گالیاں جو دی تھیں۔" ... (اب کرو بھی کنفیشن ... کیسے پوچھوں ؟... کیسے بتاؤں ؟... دونوں اُلجھن میں تھے۔ نیچے کہیں گانٹھ تھی۔ پھر

ابھی وہ باتیں کیے جارہے تھے ... اور سناؤ؟ سب ٹھیک ہے۔
"آپ کا اپنا کیا حال ہے؟" جے کے نے سگریٹ سلگاتے ہوئے گردن جھکا کر پوچھا۔
"نئے دفتر میں ہم تین جنے ہیں۔ ایک لڑکی اور ہے ...." (تیسرا لڑکا ہے) جے کے نے سوچا۔
"تیسرا بزرگ ہے" وجیتا نے بتایا "سب بڑے اچھے ہیں۔ مجھے فرلو مارنے کی بہت فوج ہے۔ جب دل کرتا ہے، فلم دیکھ لیتی ہوں، دفتر کے ٹائم میں"
(... اپنے دوست کے ساتھ؟ ...) جے کے نے اپنے من میں فقرا پورا کیا۔
"اکثر آنٹی میرے ساتھ آتی جاتی ہے، مکان مالکن۔ بڑی اچھی ہے۔ دوست بھی"
دونوں چپ ہوگئے ... اب کیا کریں؟ ... اب وجیتا خود بتائے گی .... اب جے کے خود پوچھے گا...
لیکن کوئی نہیں بولا تو جے کے نے ایک سگریٹ اور سلگائی۔
"مجھے جلدی لَوٹ جانا ہے ... ٹرین پکڑنا ہے" (اب پوچھ بھی)
"اتنی بھی جلدی کیا ہے؟" (اب بتا بھی)
"سورج ڈوبنے سے پہلے مجھے گھر پہنچنا ہوتا ہے ... آج میں بتا کر نہیں آئی" کہہ کر وجیتا بلا وجہ ہنس دی۔ .... جب جے کے کی طرف سے کوئی بات ہی نہ چلی تو وجیتا چپ ہوکر اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اچانک اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "اچھا۔ میں چلتی ہوں" کہہ کر بھی کھڑی رہی۔ اور جے کے سگریٹ کے کش لگاتا ہوا اُسے تکتا ہوا۔
وجیتا کے دائیں ہاتھ نے بائیں ہاتھ سے پرس پکڑ لیا ... بائیں نے واپس لینا چاہا۔ دونوں یوں ہی پکڑاتے رہے۔ رک گئے۔ انگلیاں ایک دوسری کو پکڑتی رہیں۔ پیر کسمسے رہے۔
جے کے نے کچھ کہنا چاہا ... کیا کہوں؟ ... یہی کچھ منٹ اور رُک جاؤ۔ مگر وہ کچھ بھی بول نہ سکا۔ وجیتا نے خود کلامی کے انداز میں کہا "ایک بات کرنا تھی..."
"ہاں بتاؤ" کہہ کر جے کے نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ سُرخ ہو گیا تھا۔

دیکھ کر جے کے کا سارا وجود بے چین ہوگیا۔ اُسے دیکھ کر وجیتا کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے پرس سمیت دونوں ہاتھ جوڑ دیئے اور دو قدم آگے بڑھ کر اپنا سر اُس کے کندھے پر رکھ دیا۔

وہ سر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھ نہ سکی۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ جسم کسی انجانی، ناقابلِ تصوّر اور ناقابلِ بیان مار پیٹ سے لوٹ رہا تھا۔ گھبرائی سی وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

جے کے کافی دیر تک تیزی سے کانپ رہے پردے کی طرف دیکھتا رہا۔ سوچتا رہا۔ اُلجھن کے بارے میں۔ اس کے کنفیشن کے بارے میں۔۔۔ (میں اسے گیٹ تک بھی چھوڑنے نہیں گیا۔ اسٹیشن تک تو کیا جانا تھا۔۔۔ یہ غلطی اس کی ہے۔ اس نے موقع ہی نہ دیا۔ دراصل دل کی حالت ہی کچھ اور تھی۔)

اسے سچائی کا احساس ہونے لگا۔ پھر اسے محسوس ہوا کہ جیسے اس کے اندر بُوند گری ہو۔ اندر کوئی ٹھنڈا سا لَو ندا جاگ رہا ہو۔ جو اس کے اعصاب اور رگوں میں گھس کر ہڈیوں تک پہنچ رہا ہو۔۔۔ جسم اور روح کی اس کارروائی کو محسوس کرنے کے لیے وہ لیٹ گیا۔ سگریٹ لگا کر دھواں چھوڑتا ہوا۔ وہ اس واقعہ کے بارے میں سوچتا رہا، جو ابھی ابھی گزرا تھا۔

• • •

جے کے سو کر اُٹھا تو ایک بج چکا تھا۔ اس نے اُٹھ کر الماری کے دروازے میں لگے آئینے میں خود کو دیکھا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں چمک تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں ہونٹوں اور گالوں کو ہلا ہلا کر عجیب سی حرکتیں کیں۔ آئینے میں دیکھنے والے شخص کو آنکھ ماری۔ سارے جسم کو تیزی سے گھما کر آئینے کی طرف پیٹھ کر لی۔ پھر اس خوبصورت شخص نے خود کو بے ترتیب اور دھول بھری چیزوں کے درمیان کھڑا محسوس کیا۔ اُسے اپنے آپ پر شرم آئی۔

جے کے نے میز پر سے تمام کتابیں اُتار دیں۔ جھاڑ پونچھ کر الماری میں سجائیں۔ چائے

والی میز، برتن اور ریاٹ صاف کیے۔ بستر سے کو جھاڑ سنوار کر نئی چادر بچھائی۔ ایک ایک بار پھر نہایا۔ استری کیے ہوئے کپڑے پہنے۔ ٹائی لگائی۔ اور کھڑکی کے پاس کھڑا ہو کر سگریٹ پینے لگا۔

کمرے کو نئے سِرے سے دیکھتے ہوئے اسے عجیب تازگی کا احساس ہوا۔ اس نے ریکارڈ پلیئر پھر آن کر دیا۔ منی بائی وہی ٹھمری پھر گا رہی تھی... "ساون بیتا جائے...." اس کے دل میں ترنگیں اٹھنے لگیں...

اس نے سوئی اٹھا دی۔ کمرے کو تالا لگایا۔ اور سیٹی بجاتا ہوا باہر کو نکل گیا.... ساری کائنات اسے اپنی طرف بلاتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

مشن کمپاؤنڈ

ریلوے اسٹیشن سے بھری دھیلے پر بیٹھ کر مشن کمپاؤنڈ کی طرف آتی ہوئی میں یہی سوچ رہی ہوں کہ انسان اس طرح اکھڑ کیوں جاتا ہے؟ وہ اپنے گھر، کنبہ اور شہر کو چھوڑ کر بھاگ کیوں کھڑا ہوتا ہے؟ میں اپنے گھر، بچّے اور شوہر کے ساتھ رہنے، مزید بچّے پیدا کرنے، لکھنؤ شہر اور وہاں رہتے اپنے دوستوں اور سہیلیوں سے اُکتا کیوں گئی؟... اب میں نے کہاں جانا ہے؟ یہ بہاؤ مجھے دھکیل کر کہاں لے جائے گا؟... مجھے ان سوالوں کے جواب چاہئیں، جو رضیہ مجھ سے پوچھے گی۔ وہ نہ بھی پوچھے تو بھی میں جاننا چاہتی ہوں۔ یہ سوالات مجھے چین سے بیٹھنے نہیں دیتے۔

یہ مشن کمپاؤنڈ ہے یا قبرستان؟... دیکھ کر حیران رہ گئی ہوں۔ گیٹ کی نشانی کے طور پر ٹوٹی پھوٹی اینٹیں پڑی ہیں۔ دائیں طرف ویران سا چرچ ہے۔ جس کی کوئی چار دیواری نہیں۔ کہیں پھول بوٹے نہیں۔ بند دروازوں اور کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹے ہوئے ہیں۔ جن میں کہیں کہیں گتّے پھنسائے ہوئے ہیں... ساری کمپاؤنڈ میں بوڑھے درختوں تلے جھاڑیاں اُگی ہوئی ہیں۔ جن پر درختوں سے جھڑے پتّے اٹکے ہوئے ہیں۔ ان کی جڑوں میں بھی اُڑتے گھومتے پتّے اکٹھے ہو گئے ہیں۔ درمیان میں سڑک ہے، ٹیڑھی اینٹوں والی جس سے پگڈنڈیاں جاتی ہیں ان چھوٹے، کھنڈر سے پرانے گھروں کو، جن کی چھتیں کھپریل کی ہیں... ایک طرف کھلی سی جگہ پر کچھ بچّے کھیل رہے ہیں۔ میں ان کو سامان اُٹھانے کو کہتی ہوں تو وہ خود ہی پوچھتے ہیں "آپ رضیہ آنٹی کے جائیں گے؟"

شام کے سات بج رہے ہیں۔ مگر رضیہ گھر پر نہیں ہے۔ میں نے اسے چِٹھی میں واضح طور پر لکھ دیا تھا۔ ٹرین لکھنؤ سے اتنے بجے چلے گی اور تیرے شہر دوسرے روز شام کو پہنچے

گی ٹائم کا پتہ خود کر لینا۔

رضیہ کے کمرے کے دروازے کی بولٹ اندر سے بند ہے۔ بچے میرا سامان برآمدے میں رکھ کر بتاتے ہیں کہ ـــ انکل اپنے کمرے میں ہیں ـــ میں اُدھر دیکھتی ہوں۔ لمبے کھچڑی بالوں والا ایک شخص تپائی پر ٹانگیں رکھے بیٹھا ہے۔ میں سلام کر کے اپنا تعارف کراتی ہوں۔

"میں برتھا جمنا داس ہوں، لکھنؤ سے آئی ہوں۔"

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی برتھا۔" کہہ کر وہ اپنا بایاں ہاتھ بڑھا دیتا ہے۔ اور دوسری کرسی پر بیٹھنے کی درخواست کرتا ہے۔ جب وہ اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑے رومال کے ساتھ دائیں طرف کے ہونٹ سے تھوک پونچھتا ہے تو اس کے خوبصورت چہرے پر دو روز سے بڑھی ہوئی داڑھی اچھی نہیں لگتی۔ وہ میرے سفر کے خوشگوار ہونے کے بارے میں پوچھتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ اس کی زبان ٹھیک طرح سے کام نہیں کرتی۔ وہ دوسری بار بھی مجھے 'برتھا' کے بجائے 'برکھا' ہی کہتا ہے۔ اس کا انگریزی تلفظ انگریزوں جیسا ہے۔ مگر وہ انگریز نہیں۔ اس کی آنکھوں کا رنگ کالا ہے، وہ اینگلو انڈین بھی نہیں۔ ملنسار مزاج سے پنجابی لگتا ہے۔

رضیہ نے مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ اصل میں کئی برسوں سے رضیہ کے ساتھ میری خط و کتابت ہی نہیں تھی۔ لدھیانہ کا کالج۔ ہوسٹل چھوڑنے کے بعد رضیہ کی صرف اتنی سی خبر ملی تھی کہ وہ ٹھیک ٹھاک ہے۔ مشن کمپاؤنڈ میں رہتی ہے۔ مشن اسکول میں ٹیچر ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ پرنسپل بن گئی ہے۔ یہ تو جب میں نے اسے زندگی سے گھبرا کر لکھنؤ چھوڑ کر کہیں بھی جا کر رہنے کی چِٹھی لکھی تھی تو اس نے لکھا ـــ میرے پاس آجا۔ یہاں اسکول میں بھی اسامی خالی ہے۔ میں بھی اکیلی رہ کر اُکتا گئی ہوں۔ میرے سامنے والا مکان خالی پڑا ہے۔ اس کی مالکن انگریز بوڑھی اپنے وطن کو چلی گئی ہے۔

انکل مجھے کچھ کہتے ہیں۔ مگر میں سمجھ نہیں پاتی۔ وہ سگریٹ ہونٹوں میں پکڑ کر گھٹنوں میں ماچس پھنسا کر سلائی جلاتے ہیں۔ میں اُٹھ کر اینٹوں سے بنی ٹوٹی ہوئی سڑک پر ٹہلتی ہوئی رضیہ کا انتظار کرنے لگتی ہوں... ہلکی سردی اور اندھیرا ہونے لگا ہے۔ بچے گھروں میں گھس گئے ہیں۔ دو نوجوان لڑکیاں اپنے گھروں کے دروازوں پر کھڑی مجھے دیکھ رہی ہیں۔ میں نے ان کی

طرف بیٹھ کر لی ہے۔ میرا منہ چرچ کی طرف ہو گیا ہے۔ توبہ، کتنی خستہ حالت ہے... اس کی یہی حالت ہونی چاہیے۔ یہ انسان کا کیا بھلا کرتا ہے؟... یوں ہی جھوٹے دلاسے۔ اس دنیا کے خواب دکھاتا ہے جس کا کوئی وجود نہیں۔ انسان کو زندگی کی سچائی سے دُور کرنے والے ہیں۔ یہ سب مذاہب۔ دھرم استھان۔...

کوئی عورت کمپاؤنڈ میں داخل ہوئی ہے۔ میں اس کی طرف چل دیتی ہوں... وہ رضیہ ہی ہے۔ اُسے دیکھ کر میں حیران رہ جاتی ہوں۔ اس نے بال بڑھا کر چوٹی کر رکھی ہے۔ ہلکے نیلے رنگ کی دھوتی پہنے ہوئے ہے۔ پیروں میں ایڑی کے بغیر سادہ چپل ہے۔... کتنی بدل گئی ہے۔

میں اُسے اپنی باہوں میں بھینچتی ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ اس کی باہوں میں اب کَس بَل نہیں رہا۔ مگر اس کا چہرہ اور جسم بھرا بھرا ہے۔ آنکھوں اور ہونٹوں میں وہی بے حد کشش ہے۔ اس کے مقابلہ میں مجھے اپنا آپ بڑا اُکھسا ہوا اور خستہ لگتا ہے۔ دُبلے پتلے جسم، سانولے رنگ عنابی۔ چہرے کی کیا اوقات؟... میرا دل پیار اور رشک سے بھر گیا ہے۔

رضیہ انکل والے کمرے میں سے گزر کر اپنے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولتی ہے۔ مجھے بیٹھنے کے لیے کہہ کر اپنے شولڈر بیگ سمیت اندر چلی گئی .. ڈرائنگ روم بڑی سادگی اور سلیقے سے سجایا ہوا ہے۔ بڑی دیوار پر صرف ایک پینٹنگ لٹک رہی ہے۔ اور یسوعؑ مسیح کی ایک تصویر، صلیب پر لٹکے ہونے کی۔ جس کے ہاتھوں اور پاؤں میں کیل گاڑے ہوئے ہیں۔ لہو بہہ رہا ہے اور سر لٹکا ہوا ہے... کارنس پر صرف انکل کی ایک فوٹو ہے۔ خوبصورت چہرے اور ہونٹوں پر لگے سگریٹ کا ایک کلوز اپ۔ چوڑا ماتھا، تیکھی ناک اور ہونٹوں پر شرارت بھری مسکراہٹ۔

لَوٹتی ہوئی رضیہ کے ہاتھوں میں ٹرے ہے۔ جس میں ٹی سیٹ ہے اور کھانے کے لیے کافی چیزیں۔ ٹرے رکھ کر وہ بہت لاڈ سے مجھے دیکھتی ہے۔ میں بوکھلا کر کہہ دیتی ہوں "انکل کو چائے دے آؤ۔"

وہ اپنے لبوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کرتی ہوئی بتاتی۔ "انکل نہیں، وہ میرا دوست ہے۔ اشوک جی" سن کر میں حیران و پریشان ہو جاتی ہوں۔

رضیہ اشوک کو سہارا دے کر میز تک لے آئی ہے۔ میں ان کو ایک بار پھر سلام کرتی ہوں۔ وہ اپنا تلفظ لکھنوی بنا کر شعر پڑھتے ہیں ؎ وہ آئے گھر ہمارے۔ خدا کی قدرت ہے ... ہم تینوں ہنس دیتے ہیں۔ اشوک جی اپنی بکھری لمبی زلفوں کو ہاتھ پھیرتے ہوئے پیچھے کرتے ہیں۔

میں نہا کر آتی ہوں تو رضیہ میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر سہلاتی ہوئی کہتی ہے "آج کی رات تم میری ہو" اور مجھے اپنا سامان بھی کھولنے نہیں دیتی۔ اپنا مکان دکھانے لگتی ہے۔ ڈرائنگ روم کے ساتھ رضیہ کا بیڈ روم ہے جس کا ایک دروازہ اشوک جی کے کمرے میں کھلتا ہے۔ دوسرا کچن کی طرف اور تیسرا باتھ روم کی طرف۔ اشوک جی کے کمرے کی طرف کھلتے دروازے کی طرف ایک تخت بچھا پڑا ہے۔ جس کے سرہانے کی طرف پڑی چھوٹی میز پر کچھ کاغذات اور ایک گلدان پڑا ہے۔ "تیرے والا مکان بالکل اس کی نقل ہے" رضیہ مجھے بتاتی ہے تو اشوک جی سگریٹ پیتے ہوئے ہماری طرف دیکھ کر مسکراتے ہیں... بڑے عرصہ کے بعد مجھے کسی مرد کا چہرہ اور کوئی مکان اچھا لگا ہے۔

"اس مکان میں رہنے والی میم مس میڈ موت سے ڈر گئی تھی بے چاری۔ اپنے دیس آئرلینڈ چلی گئی" رضیہ کی بات سن کر مجھے کنواری بوڑھی مشنری عورتوں پر غصہ آتا ہے۔ میں خود کو پُرسکون کر کے کہہ دیتی ہوں۔"میرا خیال ہے، یہ موت سے اتنی خوفزدہ نہیں ہوتیں جتنی موت سے نڈر ہونے کے بارے میں بتائے اپنے مذہب کے نظریات کے بے معنی ثابت ہو جانے سے ڈرتی ہیں"

میں نے یہ بات اپنے مزاج کے خلاف اپنے لہجہ میں تحمل پیدا کر کے کہی ہے۔ مگر پھر بھی رضیہ کا چہرہ اُتر گیا ہے.... یہ پہلے تو ایسی سنتنی نہیں تھی... سوچتی ہوئی میں سگریٹ نکالتی ہوں۔ ایک رضیہ کی طرف بڑھا دیتی ہوں.... "نہیں، شکریہ" وہ اس لہجہ میں بولتی ہے جیسے چرچ میں دعا کرتے وقت ہونٹ ہلتے ہیں۔

رضیہ رات کے کھانے کا انتظام کرنے لگی ہے۔ میں اشوک جی کے پاس بیٹھی ہوں۔ وہ مجھ سے سگریٹ لے کر خوش ہوتے ہیں۔ میں ماچس کی تیلی جلا کر ان کے سگریٹ کے نزدیک لے جاتی

ہوں ۔ تو وہ بڑے دلکش انداز سے سر کو جھکا کر شکریہ ادا کرتے ہیں ۔ آگے کو لٹکے بال پیچھے ہٹاتے ہیں ۔ ان کی آنکھیں تر ہو گئی ہیں ۔ کتنے عرصے کے بعد مجھے کسی مرد کی آنکھوں میں اتنا خلوص نظر آیا ہے ۔ شاید اس میں اس اپاہج شخص کے لیے ہمدردی کا جذبہ بھی شامل ہو ۔ ہم باتیں نہیں کرتے ۔ صرف دیکھ رہے ہیں ایک دوسرے کو ۔ خاموش رہ کر بھی کبھی بار باتیں کرنے کا احساس ہوتا ہے ۔

"یہ مشن کمپاونڈ کیسا لگا ؟" وہ پوچھتے ہیں ۔ جواب میں میں صرف مسکرا دیتی ہوں اور سگریٹ لبوں سے لگا لیتی ہوں ۔ وہ انگریزی میں ایک سانیٹ سناتے ہیں ۔ جس میں کہا گیا ہے ... ویرانے کا بھی اپنا حسن ہوتا ہے ۔ پت جھڑ رت کی بھی اپنی دلکشی ہوتی ہے ۔ قبرستان کی خاموشی میں بھی سنگیت ہوتا ہے اور موت میں بھی کشش ہوتی ہے ۔ ... رضیہ ہمارے پاس آکر کھڑی ہو جاتی ہے ۔ ہم دونوں کو برابر دیکھتی رہتی ہے ۔ اس کے چہرے پر عجب قسم کی خوشی ہے ۔ جو مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر آجاگر ہوتی ہے یا اشوک جی کو دیکھ کر ... یا ہم دونوں کو اکھٹے دیکھ ... کچھ کہہ نہیں سکتی ۔

رضیہ چلی جاتی ہے تو میں یہی سوچتی رہتی ہوں کہ ان میں دوستی کیسے ہوئی ؟ دوستی کی حد کہاں تک ہے ؟ رضیہ اس اپاہج کو اپنے پاس کیسے رکھے ہوئے ہے ؟ ... میں تو سالم و ثابت شوہر کو بھی برداشت نہ کر سکی ۔ پھر نہ دوست کو ، نہ بیٹے کو اور نہ ہی باپ کو ۔ ماں اور بھائی کیا ہوتے ہیں ، مجھے پتہ ہی نہیں ۔ اکیلے رہ کر اپنے طور پر جینا ، مجھے تو سب سے بڑا سکھ یہی لگتا ہے ۔ بشرا اپنے آپ میں آزاد ہو ۔ نہ کسی کے آسرے ہو اور نہ ہی کوئی اس کے آسرے .... بچے بھی نہیں ۔

رات کے نو بج گئے ہیں ۔ اشوک جی کھانا کھا کر اپنے بیڈ پر چلے گئے ہیں ۔ میں رضیہ کے بیڈ پر اس کے ساتھ ہی لیٹ گئی ہوں ۔ جیسے ہم کالج کے ہوسٹل میں لیٹا کرتی تھیں ۔ میں رضیہ کے چہرے کی طرف دیکھتی ہوں ۔ بغلگیر ہو جاتی ہوں ۔ ہمارے چہرے ایک دوسرے کی گردن کو لگ گئے ہیں ۔ میں اسے اپنی باہوں میں جکڑتی ہوئی اس کے بھرے کندھے کو چوم لیتی ہوں ۔ وہ ایک دم اپنا چہرہ پیچھے ہٹا لیتی ہے جیسے اسے گدگدی ہوئی ہو یا شرم آگئی ہو ۔ یا اس کے دل یا روح کی پاکیزگی کو کچھ ہو گیا ہو ۔ پھر میری طرف منہ کر کے پوچھتی ہے "اب بتا ، اتنے برس کیسے گزارے ؟"

"بس۔ خود کو زندگی میں پھنسا کر، گھسٹ کر، پھاڑ کر، پھٹ کر، توڑ کر ٹوٹ کر ... تیری طرح سنتنی بن کر نہیں۔ اب چاہے میں بالکل اُکھڑی ہوئی ہوں، مگر زندگی میں میں نے جو کچھ کیا یا زندگی نے مجھے جو کچھ دیا، مجھے اس کا افسوس نہیں۔ وہ میرے تجربات کا حصّہ ہے۔ وہ میری حصولیابی ہے یا غیر حصولیابی، میں اس کے بارے میں نہیں سوچتی ..."

"کسی سے پیار کیا؟"

"ہاں، کیا۔ پھر تم پوچھوگی، شادی کی؟ میں کہوں گی، ہاں کی ... بچّے پیدا کیے، خاوند چھوڑا۔ یار سے دھوکہ کھایا۔ یار کو دھوکہ دیا۔ عیسائی مذہب میں ڈوب کر دیکھا۔ پھر مذہب ہی چھوڑ دیا... پھر پرماتما بھی!"

میری باتیں سن کر رضیہ حیرانی سے میری طرف دیکھتی ہے۔ شاید افسوس کرتی ہوئی کہ بے چاری بر بھارا ہِ حق سے بھٹک گئی ... میں اسے صاف بتا دیتی ہوں کہ کیسے میں نے ایک ہندو لڑکے سے محبت کی۔ اپنے باپ کے روکنے پر بھی اس کی کار میں گھومتی رہی۔ اپنا سب کچھ اس کے سپرد کر دیا۔ اسے ملنے کے لیے پاگل سی پھرتی رہی۔ پھر ایک دن وہ ہندو لڑکی بیاہ لایا۔ اپنے سے دُکھی ہو کر میں نے ایک شریف کرسچین ٹیچر سے شادی کر لی۔ باپ کا حکم تھا جو میں نے مان لیا تھا۔ پھر اپنے اسکول کے ایک شادی شدہ عیسائی ٹیچر سے عشق ہو گیا۔ پتہ نہیں اس میں کیا کشش تھی کہ میں اپنے ہوش و حواس گنوا بیٹھی تھی۔ حالت کچھ ایسی ہو گئی تھی کہ میں مرنے کی خواہش کرتی ہوئی مرتی نہ تھی اور جینے کی آرزو رکھتی ہوئی جی نہیں رہی تھی ... لیکن دو برس بعد مجھے پتہ چلا کہ وہ عشق سب بکواس تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دھوکہ دے رہے تھے۔ دھول دوسروں کی آنکھوں میں جھونکتے تھے، جبکہ پڑ ہماری آنکھوں میں رہی تھی۔ ہمارے درمیان دوستی کا رشتہ دراصل ایک دوسرے کے جسم کی بھوک کا تھا۔ یا محض دھوکہ بازی تھی ... مجھے لگا کہ میرے اندر اس کے لیے تڑپ تبھی پیدا ہوتی تھی جب میرے اندر وہ بھوک پیدا ہوتی تھی۔ وہ بھی اتنی ہی دیر تک مجھے پاگلوں جیسی نظروں سے دیکھتا رہتا تھا... مگر اس کے ساتھ سچائی یہ بھی تھی کہ وہ اپنی بیوی اور بچّوں کو کبھی بھولتا ہی نہیں تھا۔ میں ہی پاگل تھی جو اسے اپنا سب کچھ سمجھ بیٹھی تھی ... ایک بار تو میں بہت جھنجھلا گئی تھی۔ شاید اسی وجہ سے یا اپنے

جسم سے کھیل کر کھلواڑ کرا کے، یا اپنی ہی ناآسودگی میں تڑپتی تڑپاتی... یا پیار کے اس جھوٹے سے ناٹک سے گھبرا گئی تھی میں.... میں پانڈیچیری کی طرف نکل گئی مشنری بننے کے ارادے سے۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد ہی مجھے محسوس ہونے لگا کہ زندگی کا مقصد یہ نہیں، کچھ اور ہے.... وہ کیا ہے؟ ... اسی سوال نے مجھے پریشان کر دیا۔ اور مجھے لکھنؤ شہر سے بھگا دیا۔ میں بھاگ کھڑی ہوئی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر۔"

"برکھا، تیری یہ نیلے رنگ کی آنکھیں اب بھی مجھے پیاری لگتی ہیں۔ اب بھی ان میں محبت دکھائی دیتی ہے۔" رضیہ لگاتار میری آنکھوں میں دیکھتی ہے۔ شاید مجھے خوش کرنے کے لیے۔ مجھے یہ بات اچھی نہیں لگتی۔ ایسا جھوٹ میں نے بارہا سنا ہے۔ ویسے بھی مجھے اپنی آنکھوں کا رنگ اچھا نہیں لگتا۔ میرے باپ اور ماں کی آنکھیں کالی ہیں۔ پھر یہ نیلا رنگ کہاں سے آ گیا؟.... مجھے لگتا ہے کہ یہ میری دادی یا نانی کے ساتھ کسی حرامکاری کا نتیجہ ہے.... میں رضیہ سے کہتی ہوں۔" رضیہ، ہندوستان میں بسنے والے تمام لوگوں کو پتہ ہے کہ ان کے آباواجداد کون تھے۔ ان کے خاندان کی جڑیں کہاں ہیں۔ مگر ہماری جڑیں نہیں ہیں۔ ہوا میں اڑتے ہوئے بیج کی طرح پتہ نہیں ہم کہاں سے اڑے اور کہاں جا کر اُگ کھڑے ہوئے؟ اب کس کس کا بیج لے کر کہاں جا کر نئے بیج اُگانے ہیں؟"

رضیہ کو میری بات چبھ سی گئی لگتی ہے۔ وہ اُٹھ کر باتھ روم کی طرف چلی گئی ہے۔

لوٹتے وقت اس نے ہمارے اور اشوک جی کے درمیان کا دروازہ بند کر دیا ہے۔

وہ میرے ساتھ ہی لیٹ گئی ہے۔ مجھے لگتا ہے، وہ میری باتوں سے اُکتا گئی ہے۔ میں ایک سگریٹ سلگا کر کہتی ہوں۔" اب تو بتا، کیسے بتائے ہیں اتنے برس؟"

رضیہ کہتی ہے

برکھا چاہتی ہے، میں اسے اپنے اور اشوک کے بارے میں کچھ بتاؤں۔ مگر ایسا کرنا بہت مشکل ہے۔ برکھا پتہ نہیں اتنی باتیں کیسے بتا گئی۔ میری تو ہر سوچ، ہر جذبہ ایک دوسری میں اس طور پر گھلے ملے رہتے ہیں کہ کسی ایک کو الگ کرنا مشکل ہے۔ وہ ایک دوسری میں مل کر اس طرح

رنگ روپ بدل لیتی ہیں کہ اصلی رنگ کھو جاتے ہیں ۔

برتھا کو دیکھ کر اس کی باتیں سُن کر مجھے جو حیرانی ہوئی اس کا بتانا بھی مشکل ہے ... اُسے کسی میں اعتماد نہیں رہا، کسی میں ایمان نہیں ۔ بے چاری بے چین روح ۔ یسوع مسیح کی بھٹکی ہوئی بھیڑ ... دراصل اس نے کچھ فیصلے کر لیے، جو بتائے جا سکتے ہیں ۔ جو میں نہیں کر سکی ۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ہر بات بتانے والی بھی نہیں ہوتی ۔ یہ بات برتھا کے سمجھنے کے لیے بھی نہیں ۔ تیزی سے فیصلے کرنے والی اس کی سوچ فیصلہ ہونے سے اِس پار اور اُس پار کی بات شاید پوری طرح پکڑ نہ سکے ۔ پھر بھی میں اس کو بتاتی ہوں ۔ ”ہمیں بچھڑے کو گیارہ برس ہو گئے ہیں ۔ بی ۔ ایڈ کر کے جب تو لکھنو گئی تو میں اس مشن کمپاؤنڈ میں رہنے لگی تھی ۔ کچھ عرصہ بعد ہی میں خود کو تنہا تنہا سی محسوس کرنے لگی تھی ۔ من اداس رہتا ۔ سہیلیاں ساتھی سب بکھر گئے تھے ۔ اِرد گرد کوئی بھی اپنا نہیں تھا ۔ ایک سامنے والے مکان میں رہنے والی بزرگ مشنری مس میڈ تھی ۔ جس کے ساتھ دل کی بات کر لیتی تھی ۔ وہ پتہ نہیں کیوں بھری جوانی میں ہی اپنا گھر خاندان چھوڑ کر دکھوں بھرے اس ملک میں آ گئی تھی ۔ یسوع مسیح کا حکم مان کر ۔ وہ بہت مذہبی، عالم اور رحمدل عورت تھی ۔ اس کو مل کر محسوس ہوا تھا، اس کے پاس میرے دُکھ کی دوا ہے ۔ میرے سوالوں کے جواب ہیں اس کے پاس ۔ اس کی محبت میں رہ کر مذہبی کتابیں پڑھ کر میں سمجھ سکی تھی کہ زندگی کا مقصد کیا ہے؟ انسانوں کے دُکھ بانٹنا ...“

کیا میں برتھا کو یہ بات بتا دوں کہ اس کے ساتھ میرے دل میں ایک بھوک بھی بیدار ہوئی تھی، اپنا گھر بسانے کی جس میں میری ماں ہو، بہن بھائی ہوں، پھر شوہر ہو اور بچے ہوں ۔ میرا وجود کتنے ہی رشتوں میں باندھا جائے ۔ جیسے دوسرے رہتے ہیں ... پتہ نہیں مشن والے مجھے کہاں سے لے آئے تھے؟ میں کہاں پیدا ہوئی تھی؟ کس ماں کا دودھ پیا تھا؟ ... مگر برتھا یہ سب تجربے کر چکی ہے ۔ مجھے ڈر ہے، وہ میرا مذاق اُڑائے گی ۔ خیر میں اسے بتاتی ہوں ...

”میں نے خود کو کتابیں پڑھنے میں غرق کر لیا ۔ ایم اے کیا ۔ اور مشن اسکول میں ہی پڑھاتی رہی ...“

”تو اشوک جی کے ساتھ قائم ہوئے تعلقات کے بارے میں بتا“ برتھا اتاولی ہو کر

پوچھتی ہے... سوچتی ہوں کہاں سے شروع کروں، اشوک جی تو بہت بعد میں ملے ہیں۔ خیر برکھا کی خوشی کے لیے بتاتی ہوں۔'' ان سے میری واقفیت اخباروں رسالوں کے ذریعے ہوئی ہوئی تھی۔ یہ جرنلسٹ ہیں۔ اُن دنوں یہ شہر کی کلچرل سرگرمیوں کے بارے میں لکھا کرتے تھے۔ ہر ایک فیچر کے ساتھ ان کی فوٹو چھپتی تھی، منہ سے لگے سگار والی۔ شہر کے پڑھے لکھے لوگوں میں ان کی تحریروں کا چرچا ہوتا تھا۔ جن کو پڑھ کر مجھے احساس ہوتا تھا اس جرنلسٹ کی سوچ میں کتنی گہرائی ہے۔ کبھی لگتا، اگر یہ جرنلسٹ اس طرح لکھتا رہا اور میں اسے پڑھتی رہی تو میں بے چین ہو جاؤں گی۔ اس کی تحریریں پڑھنے والے کے پیر نہیں جماتی تھیں بلکہ اکھاڑتی تھی۔ ویسے لگتا کہ اس کا مقصد یہ نہیں۔ یہ تو دل کی گانٹھوں کو چھیڑتا ہے اور کھولنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ بھارتی ثقافت، اخلاقی قدروں اور عورت کی آزادی کے بارے میں سوال اُٹھاتا ہے۔ کئی بار میں جھلا اٹھتی تھی۔ اس کے منفی رویّے سے۔ دل چاہتا تھا کہ میں اس سے مل کر بات کروں...''

''دراصل مجھے پیار ہونے لگا تھا اس کے ساتھ'' برکھا سگریٹ کا کش لگا کر کہتی ہے۔ مگر یہ بات ٹھیک نہیں۔ اگر میں دلیل دوں تو برکھا مانے گی نہیں... میں کچھ سمجھنے کے لیے اور کسی نتیجے پر پہنچنے اور اس سے پیار جانے کے لیے کتنی اُتاولی تھی، برکھا یہ بات بھی نہیں سمجھے گی۔ جیسے میں یہ نہیں سمجھ سکتی کہ برکھا سگریٹ کیوں پیتی ہے؟ اس کی سوچ اپنے مرکز سے ہٹ کیوں جاتی ہے؟ ... میں اسے بتاتی ہوں۔'' ان دنوں پیار والی کوئی بات نہیں تھی۔ لیکن سیمینار میں مَیں نے اسے تقریر کرتے سنا۔ میں نے بھی دو ایک سوال کر ڈالے۔ اس نے جو جواب دیئے، ان سے میرے سوالوں کا خاتمہ ہو گیا۔ مگر گھر آنے پر میرے اندر مزید کئی دلائل اور سوال پیدا ہوئے۔ مجھے لگا، ان سے میں اسے لاجواب کر سکتی ہوں... شام کو ہی میں اس کے گھر چلی گئی...

''یہ اس کی کشش تھی بی بی'' برکھا کہتی ہے۔ مگر یہ بات تب ٹھیک نہیں تھی جب میں اپنے گھر سے نکلی تھی۔ کافی بعد میں صحیح ہوئی۔ جس کی خبر اس کے گھر جا کر مجھے ہوئی... میں برکھا کو بتاتی ہوں'' وہ ایک چوبارہ میں رہتا تھا۔ نیچے ایک اور خاندان رہتا تھا۔ سیڑھیاں چڑھ کر اس کے دروازے کی چق کو ہاتھ لگانے تک میری حالت بہت خستہ ہو چکی تھی۔ ہر قدم پر میں

لوٹ جانے کا ارادہ کرتی رہی تھی۔ اچانک اس کی آواز آئی "اندر آجاؤ"۔

"وہ چھوٹی لمبی تپائی پر ٹانگیں پسارے سگار پی رہا تھا۔ میرے اندر پہنچتے ہی اس نے ٹانگیں اُتار کر فرش پر پاؤں ٹکا لیئے۔ میں نے سلام کیا۔ اس نے تپاک سے بیٹھنے کو کہا۔ اس نے میرے آنے کا سبب ایک دم نہیں پوچھا۔ بلکہ سگار پیش کیا۔ میں نے شکریہ کہہ کر انکار کر دیا۔ کچھ پل ہم خاموش بیٹھے رہے۔ پھر اس نے چائے کو پوچھا۔ میں نے نہ کہہ دی تو اس نے کہا "کافی تو ہم پیئیں گے ہی۔ اور اُٹھ کر کچن میں کافی بنانے لگا۔

"کافی پیتے ہوئے میں وہ کوئی بات نہ کر سکی۔ جو سارے راستے میں سوچتی آئی تھی۔ وہ میرے بارے میں، بزرگ مشنری مس میڈ کے بارے میں اور مشن کمپاؤنڈ کے بارے میں پوچھتا رہا۔ مجھے یہ جان کر بڑی حیرانی ہوئی کہ وہ میرے بارے میں پہلے ہی کافی کچھ جانتا تھا۔ جبکہ میں اس کا صرف نام ہی جانتی تھی۔ مجھے لگا، یہی فرق ہے میرے اور اس کے کسی بات کی تہہ تک پہنچنے کے ڈھنگ میں۔ میں نے مس میڈ کے پاس رہ کر اس کی زندگی کے بارے میں کچھ نہ جاننا چاہا۔ اس کا کتابی علم ہی تلاش کرتی رہی۔ مگر اشوک دُور رہ کر بھی اس کے بارے میں کافی کچھ جانتا تھا، یہ بات کہی تو اس نے یونہی تھی مگر مجھے پریشان کر گئی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ اکثر صبح کے وقت اپنے ایک کیمسٹ دوست کی دوکان پر بیٹھتا ہے۔ جہاں سے میں گزرتی ہوں ... اتنے میں فون کی گھنٹی بج گئی۔...

"اس نے ریسور رکھ کر جب پوچھا 'میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟' تو میں گھبرا گئی۔ لیکن جب میں نے بتایا کہ میں تو آپ کی فین ہوں۔ تو وہ شرما گیا۔ بہت زیادہ۔

"اس نے کہیں فنکشن پر جانا تھا۔ مجھے مشن کمپاؤنڈ تک چھوڑنے کے لیے اس نے بہت زور ڈال کر مجھے اپنے اسکوٹر کے پیچھے بٹھا لیا۔ ... سارے راستے میں سکڑ کر بیٹھی رہی، اس کو چھو جانے کے ڈر سے۔ ہر ایک موڑ پر رکاوٹ مجھے پریشان کرتی رہی۔ ... گھر آکر یہ سب کچھ عجیب سا لگا، جو بیتا تھا۔ کئی روز میں اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ ..."

"بس یہاں سے حسین دھوکہ شروع ہوتا ہے۔ آدمی خود کو دھوکہ دینے لگتا ہے۔ مچھلی پتھر چاٹنے کے لیے جانے لگتی ہے۔" برکھا کہنیوں کے بل ہو کر مجھے تاکتی ہے۔ اس کی بات میں سچائی بھی

ہو شاید۔ مگر اس کا لہجہ غصیلا اور طنز بھرا ہے۔ جیسے کوئی بدلا لینے کے لیے بولتا ہے۔ میں اسے بتاتی ہوں ''اشوک ہندو ہے۔ مگر اس کی باتوں سے لگتا تھا کہ وہ دنیا بھر کے انسانوں سے پیار کرنے والا ہے۔ اس طرح وہ ایک نیک دل عیسائی ہے۔ اس نے میری طرح صرف دینی کتابیں ہی نہیں پڑھیں۔ اس کی سوچ کی دنیا بہت وسیع ہے۔

''ہم کئی بار ملے۔... اس سے ملنے سے پہلے، اس سے ملنے کے بعد اس گھر میں اور اسکول میں مَیں اکیلی اُداس بیٹھی رہتی تھی۔ مگر یہ بات میں اپنے چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیتی تھی۔ کوشش کر کے ظاہر ہونے سے روک لیتی تھی۔ پھر پتہ نہیں مس میڈ نے کیسے بُوجھ لی... ایک رات میں اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھی پڑھتی رہی تھی۔ پر مجھ سے پڑھا نہیں جا رہا تھا۔ مس میڈ چپکے سے آئیں۔ انھوں نے میرے پیچھے سے میرے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ اپنی چھاتی سے لگایا۔ میرا ماتھا چوما۔ میرے سامنے بیٹھ کر پوچھنے لگیں 'کیا ہو گیا میری بیٹی کو؟'... میں اپنی ذہنی کیفیت سے خود ڈری ہوئی تھی۔ میں نے سب کچھ بتا دیا۔ وہ مجھے دلاسے دیتی رہی۔ پھر جاتی ہوئی کہہ گئی 'دیکھو بیٹی، حرامکاری اپنے مذہب میں گناہ ہے۔... اس بات نے مجھے بُری طرح جھنجھوڑ ڈالا۔ میں سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ حرامکاری کیا ہے اور کیا نہیں ہے؟ کیا اس سے ملنا بھی؟'

''حرامکاری کچھ نہیں ہوتی۔... حرامکاری وہ ہے جسے ہزاروں برس پہلے کی دینی کتابوں نے گناہ کہا ہے۔ دھوکہ، ملاوٹ، رشوت، انسانوں کے قتل کوئی حرامکاری نہیں، ان کی نظر میں۔ ان کی ساری سوچ ٹیڑھی ہے۔'' برتھا کا لہجہ اس کی بات سے زیادہ تلخ ہے۔ لیکن میں نرمی سے کہتی ہوں ''یہ کچھ کہنا بھی گناہ ہے، یسوع مسیح کی نظر میں، تُو نے بائیبل کو ایمان لا کر نہیں پڑھا۔'' مگر برتھا یہ بات مانتی نہیں۔ چوٹ کھایا ہوا دل ہے نا اس کا۔ سچّائی کو تسلیم نہیں کرتا۔ میں اس سے اس بحث میں الجھنا نہیں چاہتی۔ اسے صرف اپنی بات بتاتی ہوں۔ ''ہم ملتے رہے۔ بہت بہت دیر تک اکیلے بیٹھے رہتے۔ کبھی اس گھر میں اور کبھی اس کے گھر میں۔ اس نے ہمیشہ میرے مذہبی ایمان اور آدرش کا احترام کیا۔ اس کا ہاتھ میری نظروں کو دیکھ پیچھے ہٹتا رہا۔

''ایک روز میں اشوک کے گھر گئی۔ ہم نے مل کر کافی بنائی۔ کافی پیتے ہوئے وہ مجھے اپنے بارے میں بتاتا رہا... وہ ایک امیر گھرانے سے بغاوت کر کے بھاگا ہوا تھا۔ جہاں اس نے واپس

نہ جانے کی قسم کھا رکھی تھی ... مجھے لگا وہ بھی میری طرح لنگر کے بغیر بادبانی جہاز ہے۔ جسے کسی کنارے کا علم نہیں۔ مگر کسی کنارے لگنے کی امید ضرور ہے۔ ہم دونوں خانہ بدوش ہیں۔

"ایک روز اس کے کمرے میں بیٹھے ہوئے مجھے لگا، وہ بہت جذباتی ہو گیا ہے۔ یا میرا دل ہی ٹھہر نہیں رہا تھا۔ میں اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ باہر کی طرف دیکھتی رہی... اس نے اٹھ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ مجھے لگا، وہ اب کہے گا — آئی لو یو..."

"پھر اس نے کہا؟"

"نہیں"

"تو نے بھی نہیں کہا؟"

"نہیں۔ کبھی بھی نہیں... کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ وہ اپنے سکھ دکھ اپنے تک ہی رکھنے والا ہے۔ ایک روز ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہم باتیں کرتے رہے۔ پتہ نہیں کیسے بات عورت کی آزادی کی چل نکلی۔ اور پھر مذہب پر آگئی۔ وہ ایک دم جھنجھلا گیا۔ اور ہندو دھرم بھارتی تہذیب اور اس کے ضابطہ اخلاق کی مذمت کرتا ہوا پہلے عیسائیت اور پھر اسلام کی کترنیں کاٹ کاٹ کر پھینکنے لگا۔ وہ بار بار عیسائی مذہب کا یہ حوالہ دیتا جس میں عورتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ — اے نیک بیبیوں، تم اپنے شوہروں کے تابع رہنا.... پھر وہ تابعداری تابعداری کہتا ہوا یہ بھول ہی گیا کہ اس کے سامنے میں بیٹھی ہوں، بائیبل میں ایمان رکھنے والی... جب اس کو اس کا خیال آیا تو اس کا ہاتھ میرے ہاتھ پر ٹک گیا۔ زبان بند ہو گئی اور سر جھک گیا...

"گھر آکر میں سوچتی رہی۔ مجھے لگا کہ ہم اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ دور تک، ہمارے درمیان چوڑی خلیج ہے... کبھی کبھی مجھے لگتا، اس کے پاس رہنا اگر گناہ نہیں تو گناہ جیسا کچھ ہے... پھر رفتہ رفتہ لگنے لگا کہ یہ اس کے دل کی ایمانداری ہے جو سچائی اور یقین سے بھی بڑی ہوتی ہے اشوک میرے یقین اور ایمان سے بڑا ہے۔"

"میں نے بھی اس ہندو لڑکے کے ساتھ گھومتے ہوئے یہی دھوکہ کھایا تھا۔ بشر جسم کی محبت میں اتنا اندھا ہو جاتا ہے کہ اسے پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ اپنا کیا کھو رہا ہے۔" بر تھا غصے

میں نہیں بولی۔ یہ بات اس نے تجربے کی سچائی کے طور پر بتائی ہے۔ ویسے مجھے بھی پتہ ہے کہ جب کوئی ایک شے دوسری میں ملتی ہے تو اسے اپنا کچھ نہ کچھ تو گنوانا ہی پڑتا ہے۔ اپنا رنگ، اپنا روپ، اپنی خوشبو اور کبھی کبھی اپنا وجود بھی۔

"برتھا، میں سچ کہتی ہوں۔ اس رات، اتنی دیر سوچنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا اس دہریئے کے لیے اپنا وجود وقف کر دینے کا۔"

"ایک دن ایک حادثہ سا ہو گیا۔ میں اس کے کمرے میں تھی۔ باتیں کرتے ہوئے اس کے ہاتھوں سے اچانک سگار گر پڑا۔ وہ تڑپتا ہوا کرسی سے فرش پر آ گرا۔ میں نے بمشکل اسے اٹھا کر بیڈ پر لٹایا۔ پھر سوچوں، اب کیا کروں؟ نیچے والے پڑوسیوں کو بلانے کی میری جرات نہ ہوئی۔۔۔۔ کچھ سوچ کر میں نیچے اتری۔ مگر کسی کو بلا نہ سکی۔ ڈاکٹر کو تلاش کرنے نکل پڑی۔ مگر راستہ میں سے ہی لوٹ آئی۔ دل میں آئی، اسے دیکھوں تو سہی۔۔۔ اوپر جا کر دیکھا۔ وہ ہوش میں آ گیا تھا۔ مگر حواس مکمل طور پر درست نہیں تھے۔ اس نے بتایا کہ اسے ایسے میں کبھی کبھی چکر آ جاتا ہے۔ ہاتھ پیر اینٹھنے لگتے ہیں۔ میں نے اسے شراب پینے سے روک دیا۔ میں نے منع نہیں کیا بلکہ ہاتھ جوڑ کر درخواست کی۔ جو اس نے قبول کر لی۔۔۔ مگر اس کی بیماری کی وجہ کوئی اور ہی تھی۔"

"اور کیا تھی؟"

"بیماری تھی۔۔۔ جس کا علم مجھے اس دن ہوا جب وہ اس گھر میں پہلے سے بھی زیادہ تڑپ کر گر اٹھا۔ اس کا ماتھا پھٹ گیا تھا۔ وہ زمین پر پڑا اس طرح تڑپنے لگا، جیسے جان نکل رہی ہو۔ ابھی کمپاؤنڈ والے جاگ رہے تھے۔ رات زیادہ نہیں تھی گزری۔ میں نے بھاگ کر مدر میڈ کا دروازہ اتنے زور سے کھٹکھٹایا کہ سارے کمپاؤنڈ میں شور مچ گیا۔ لوگ دروازے کھول کر دیکھنے لگے۔ سب میرے گھر میں اکٹھے ہو گئے۔ ہم نے مل کر اسے اٹھا کر بیڈ پر لیٹایا۔ میں بھاگ کر کرسچین ہسپتال سے اپنی دوست ڈاکٹر مسز کلارک کو بلا لائی۔ وہ ہسپتال کی ویں میں ہمیں لے گئی۔ اشوک کو داخل کر لیا گیا۔

"تیسرے روز اسے پھر دورہ پڑا۔ پھر زخمی ہو گیا۔ ڈاکٹر کلارک نے بتایا کہ یہ دورے مرگی کے ہیں۔ پندرہ روز کے بعد اسے ہسپتال سے چھٹی کر دی گئی۔۔۔ اب میری نئی الجھن پیدا

ہو گئی تھی۔ مجھے ہر وقت یہی ڈر رہتا کہ پتہ نہیں وہ کب اور کہاں گر پڑے۔ اُسے کوئی اُٹھانے والا ہو یا نہ ہو۔ وہ فرش پر پڑا تڑپتا ہوگا اور میں کہیں گپیں ہانکتی، سینما دیکھتی، کھانا یا آئس کریم کھاتی ہوں گی ـ.... برتھا... نہ میں اس کے گھر میں رہ سکتی تھی اور نہ ہی اس کو اپنے گھر میں رکھ سکتی تھی۔ تجھے معلوم ہے برتھا، تصوّر میں گزر رہے اپنے کا دُکھ؟... وہ حقیقی طور پر گزرے واقعہ سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ گزر رہا واقعہ تو سامنے ہوتا۔ مگر تصوّر کے حادثہ کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ اس کا دُکھ پھیلتا پھیلتا آدمی کو ڈھنتا رہتا ہے۔...

"اشوک کی بیماری کی خبریں تمام اخباروں میں شائع ہوئیں۔ دیکھنے بھی بہت لوگ آئے۔ مگر اب وہ کہاں اور کیسے رہے گا، اس کا خیال کسی کو بھی نہیں آیا۔... برتھا، بشر دنیا میں کیسے رہ پاتا ہے، اس بات کا احساس مجھے پہلے بھی ہوا تھا مِس میڈ کے بارے میں سوچتے ہوئے۔ مگر اس کی شدّت کا احساس مجھے تب ہوا، اشوک کے بارے میں سوچتے ہوئے کہ کیسے آدمی کے ساتھ جُڑے ہوئے لوگ رفتہ رفتہ ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور وہ اکیلا موت کے اندھیرے کی طرف بڑھنے لگتا ہے... میں ہر وقت لیٹی سوچتی رہتی تھی۔

ایک رات مدر میڈ میرے پاس بیٹھی کافی دیر تک باتیں کرتی رہی۔ جب اس نے اشوک کا حال پوچھا تو میں بول ہی نہ سکی۔ بس رو دی۔ مدر میڈ کی نیلی آنکھیں مجھے تکتی رہیں۔ اس کے دونوں ہاتھ جُڑ کر ٹھُڈّی کو سہارا دے کر ٹکے رہے۔ پھر اس نے اپنے ڈھیلے اور بے جان سے لبوں کو پونچھتے ہوئے کہا 'تو اُسے یہاں لے آ۔ اس کا علاج کراؤ.... پہلے تو لگا، وہ میری بات سمجھی نہیں۔ پھر لگا وہ تو دل کی باتیں جانتی ہے۔ میں ہی اس کی بات نہیں سمجھ سکی۔ میں نے پوچھا 'پھر ماں، یہ گناہ نہیں۔ حرامکاری؟'"

"مِس میڈ سوچ میں غرق ہو گئی۔ پھر یہ کہہ کر خاموش ہو گئی... تو اسے میرے پاس لا۔ کسی روز، میں اس سے بات کروں گی!... کئی روز بعد اشوک نے مجھے بتایا کہ مِس میڈ خود اس کے گھر گئی تھی۔ اسے شادی کرنے کے بارے میں پوچھنے کے لیے۔ مگر وہ مانا نہیں تھا۔ وہ وہ اپنی خراب صحت کے سبب مجھ پر بوجھ نہیں بننا چاہتا تھا... یہ باتیں اس نے مجھے اس کمرے میں بیٹھ کر بتائیں۔ جب میں نے پوچھا۔ اشوک کیا تم دُور رہنا چاہتے ہو مجھ سے؟ تو اُس

نے اتنی دُکھی نظروں سے مجھے دیکھا کہ میں برداشت نہ کر سکی۔ اس نے صرف اتنا کہا۔ ایک پل کے لیے بھی نہیں ..... اور منہ پھیر لیا۔ دیوار کی طرف دیکھتا رہا، جہاں یسوع مسیح کی تصویر ٹنگی ہے۔"

"اور تو اتنے میں پھنس گئی؟" برتھا میرے چہرے کی طرف دیکھتی ہوئی کہتی ہے۔ مجھے اس کی بات بُری سی لگتی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ برتھا اکھڑی ہوئی ہے۔ وہ میرے جذبہ کو سمجھنے سے قاصر ہے ... میں اُسے کیا بتاؤں ... آدمی کی زندگی میں کچھ لمحے ایسے بھی آتے ہیں جب اسے ناچیز سی خود غرضیوں سے اوپر اُٹھنے کا موقع ملتا ہے، یسوؑع مسیح کی مہربانی سے وہ برتھا کی زندگی میں آئے ہوں گے۔ مگر بدنصیب شخص انھیں گنوا دیتا ہے ... جب اسے اس کا علم ہوتا ہے تو پچھتاتا ہے ... ایسا نہ ہو تو برتھا کی طرح گمراہ ہو جاتا ہے۔ یسوؑع مسیح کی کھوئی ہوئی بے چاری بھیڑ کی طرح .... میں کہتی ہوں" میں سچ کہتی ہوں برتھا۔ اس میں کوئی اور ہی لطف ہے، خود کو کسی اور کے لیے وقف کر دینا۔ صرف کر دینا۔ خود غرضی کے جال سے نجات پالینا۔ میں انتظار کرتی رہی کہ اشوک میرے دل کی بات سمجھے گا۔ وہ مجھے مذہبی اعتقادات میں اندھی نہیں بلکہ کچھ سوچ سمجھ کر کہنے اور عمل کرنے والی سمجھے گا ... مگر اس کے لیے مجھے کافی مدّت انتظار کرنا پڑا۔

"مس میڈ نے پتہ نہیں اشوک سے کیا کہا اور اس کے دل میں خدا جانے کیا آیا ... کرسمس کے دن تھے۔ ہم تینوں یہاں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ہمارے درمیان بات چیت کا کوئی موضوع نہیں تھا۔ کبھی ایک دوسرے کو دیکھ لیتے اور کبھی نظریں جھکا لیتے ... پھر مجھے لگا، ہم تینوں رکے رہنے کی اس حالت کو بہت دیر برداشت نہیں کر سکیں گے۔ دیکھنے اور سوچنے کی اس کھینچ تان میں سے پہلے اشوک نکلا۔ اس نے مدر میڈ کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔ بولا' میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا'... یہ بات اس نے ایسے کہی جیسے بپتسمہ لے رہا ہو۔ یا کوئی ہندو بدھ کی شرن میں جا رہا ہو۔

"اس کے بعد کئی روز تک میں بے حال سی رہی۔ برتھا، بہت خوشی بھی کبھی انسان کو بے حال کرتی ہے۔ بائیبل میں آتا ہے ـــ بہت خوش نہ ہو، کیونکہ اس کے بعد آنے والے دُکھ تم برداشت نہ کر سکو گے ـــ محبت سُکھ ہی نہیں دیتی دُکھ بھی دیتی ہے۔ ایک حد کے بعد

اندیشے پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔"

"اندیشے یہ کہ وہ کہیں کسی اور کے ساتھ نہ چلا جائے؟" برکھا اپنی چھوٹی نیلی آنکھیں سکوڑتے ہوئے طنز کرتی ہے۔

"نہیں۔ وہ اس لیے کہ اتنی خوشی کو دیکھ کر کہیں فرشتے کچھ اور نہ سمجھ بیٹھیں کسی خدائی قوت سے جلی شمع کی لَو مدھم نہ پڑ جائے۔

"چند روز بعد مدر میڈ نے چرچ میں ہماری شادی کرادی۔ برکھا، وہ اپنی قسم کی انوکھی ہی شادی تھی۔ جس میں اشوک کو عیسائی بننا نہیں تھا پڑا اور نہ ہی مجھے مذہب چھوڑنا پڑا تھا۔ شادی چرچ میں ہوئی تھی، تین پکاریں دے کر۔ مگر مذہب کی پابندیوں سے آزاد۔ اس بات سے مدر میڈ دکھی نہیں، خوش ہوئی تھی۔ اس نے مجھے اکیلی پاکر کہا تھا 'بیٹی یہ بھی ٹھیک نہیں کہ آدمی ساری عمر خود کو دینی پابندیوں میں اُلجھائے رکھے... مجھے تو اب لگتا ہے کہ ان سے آزاد ہو کر بھی انسان خدا کی مہر کا حقدار ہو سکتا ہے... مدر میڈ کی بات سن کر مجھے دُکھ ہوا کہ مدر میڈ اس بوڑھی عمر میں آکر عیسائی مذہب کی پابندیوں سے اُکتا گئی تھی۔ خدا اس پر رحم کرے۔

"ان دنوں اشوک بالکل ٹھیک ہو گیا تھا۔ وہ اتنا خوش تھا کہ دوائیاں کھانا بھی بھول گیا تھا۔ ہم نے سارا مکان نئے سِرے سے سنوارا، سجایا۔ میری الماری کتابوں سے بھر گئی اور کچن برتنوں اور کھانے پینے کے سامان سے، دیواروں اور دروازوں کے رنگ بدل گئے۔ گھر کا سارا کردار ہی بدل گیا... یقین کرنا برکھا، مجھے لگا میں بالکل تبدیل ہو گئی ہوں۔ میری روح میں بسی ساری اداسی دُھل گئی ہے۔ اشوک پھر سے فیچر لکھنے لگا۔ ہم نے مدر میڈ کے ساتھ مل کر سارے مشن کمپاؤنڈ کی شکل ہی بدل دی۔ نئے درخت، بوٹے نئی ترتیب سے لگوائے۔ سڑک کے دونوں طرف سرو کے بُوٹے لگوائے۔ آڑی ترچھی اینٹیں لگا کر پھولوں کی کیاریاں بنوائیں۔ بچوں کو پھول، بُوٹے اُگانے اور پالنے سکھائے۔... مگر چرچ کو ٹھیک ٹھاک کرنے کی میری حسرت ہی رہی۔ اشوک واضح الفاظ میں کچھ نہیں کہتا تھا۔ خاموش ہو جاتا تھا میری تجویز سُن کر۔ یا کبھی کہہ دیتا: رضیہ، ہمیں اپنے دل صاف رکھنے چاہئیں۔... مجھے اس کی یہ تو کیا کوئی بھی بات بری نہیں لگتی تھی۔ میں اس کی محبت میں اتنا کھو گئی تھی۔ ایک روح ہو گئی تھی..."

"یہ بات میرا دل مانتا نہیں رضیہ۔ انسان کے دل میں ہر وقت ایک ہی سا جذبہ برقرار نہیں رہ سکتا۔ وہ تولہ ماشہ ہوتا ہی رہتا ہے۔ کبھی کبھی تو تولہ من بھی ہو جاتا ہے ... تجھے میں بتاؤں کہ انسان محبت کے مکالمے کب بولتا ہے؟... جب وہ اپنے محبوب کو پالینے کی خواہش میں جل رہا ہوتا ہے۔ یا حاصل کرنے ہی والا ہوتا ہے.... اور محبت کے یہ بول معلوم ہے کب منہ سے خود بخود نکلتے ہیں؟... جب انسان محبت کر رہے ہوتے ہیں۔ ان کی ساری سوچ، سارا شعور ایک نقطے پر مرکوز ہوتا ہے... مگر بولتا اس وقت بھی جھوٹ ہی ہوتا ہے۔ اور جب وہ نقطۂ عروج سے لوٹتا ہے پھر پتہ ہے کیا ہوتا ہے؟... دوسرے کے نقوش کی دلکشی، جسم کی خوشبو اور اس کی شہد مصری سی میٹھی آواز کا جادو ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کے خدوخال غیر متناسب ہو جاتے ہیں۔ جسم سے بدبو آنے لگتی ہے... میں تو تیرے پر حیران ہوں رضیہ، تو شادی کر کے بھی اشوک کو دوست ماننے بیٹھی ہو۔ جبکہ ہر ایک حرامزادہ دوست شادی کے بعد ایک دم شوہر بن کر بیٹھ جاتا ہے، وہ مالک بن جاتا ہے تمھارے جسم کا، روح کا، سوچ کا، ہر شے کا... میں تو اس بقلول سے عیسائی ماسٹر کے بدلتے ہوئے رویے پر حیران رہ گئی تھی۔ ایک روز میں اسے بتائے بغیر سنیما شو دیکھنے چلی گئی تھی۔ گھر لوٹی تو تھپیڑ مار دیا تھا اس نے۔ کمینے نے۔" برکھا نے بڑی تفصیل سے اپنے تجربات کا نچوڑ بتایا ہے۔ یہ اس کے اپنے تجربات اور احساسات کی سچائی ہو سکتی ہے۔ مگر میرا تجربہ کچھ اور ہے۔ میں اسے بتاتی ہوں۔ "میں بھی بدلی۔ برکھا، مجھے جینے کا ڈھنگ آیا... پہلے مجھے سگریٹ کا دھواں اچھا نہیں لگتا تھا۔ پھر سگار کی بو بھلی لگنے لگی۔ میں نے دوسروں کے بارے میں سوچنا سیکھا۔ اشوک کے بارے میں، مدر میڈ کے بارے میں، مشن کمپاؤنڈ کے تمام لوگوں اور تمام انسانوں کے بارے میں۔ اشوک کے سبب میں لوگوں کے دکھوں کے اسباب، مذہبی بنیادوں سے ہٹ کر اس نظام میں تلاش کرنے لگی... مگر اس دوران میں ہم پر ایک نئی مصیبت آپڑی۔ ایک صبح کو اشوک باتھ روم میں گر پڑا۔ ہم اٹھا کر ہسپتال لے گئے۔ پر اس پر فالج کا حملہ ہو چکا تھا۔ وہ ایک مہینہ مشن ہسپتال میں رہا۔ مگر مکمل طور پر ٹھیک نہ ہو سکا۔ مایوس ہو کر ہم گھر لے آئے.... اس بات کا صدمہ مجھے ہی نہیں مدر میڈ کو بھی بے حد لگا۔ وہ

اتنا گھبرا گئی کہ اس گھر، اس کمپاؤنڈ، اس ملک اور اس دنیا سے ہی بے رخی اختیار کر گئی.
بے چاری کچھ روز چارپائی پر پڑی رہی پھر ایک مشنری کے ساتھ اپنے ملک کو چلی گئی...
مجھے لگا، اس نے میری جگہ سکھ دُکھ جھیلا تھا۔ یہ سوچتے ہوئے میرے تصوّر میں مدر میڈ کی
زندگی کے وہ سکھ دُکھ آتے رہے۔ جن سے چھٹکارا پانے کے لیے مشنری بن کر اس ملک میں
آئی تھی۔ دُکھی غریبوں کے دُکھ بانٹنے کے لیے۔ اس کے جانے کے بعد میں دوسروں کے
دُکھ بانٹنے کے ڈھنگ سیکھ رہی ہوں"... میری بات سن کر برتھا بہت سنجیدہ ہو گئی ہے۔
اس کا چہرہ بہت نرم اور آنکھیں تابناک اور نمدار ہو گئی ہیں۔ اب میرا دل چاہتا ہے کہ اسے
بہت کچھ وہ بتا دوں جو کسی کو بتا نہیں سکی۔ میں اسے بتاتی ہوں..." تجھے ایک بات اور بتاؤں
برتھا، کبھی کوئی انسان ایسی بات کہتا ہے جس کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ یا اس وقت سمجھ میں
نہیں آتی۔ مگر بعد میں پتہ چلتا ہے کہ اس کے معنی کتنے بڑے۔ بھتے... ایک بار پارک میں ٹہلتے
ہوئے اشوک نے مجھے کہا 'تیری یہ چیک ساڑھی بہت پیاری لگتی ہے۔ میں سمجھی کہ یہ رسمی سی
تعریف ہے۔ پھر اس نے کہا 'جب یہ تیرے کام کی نہ رہے تو مجھے دے دینا'۔ 'تم کیا کروگے؟'
میں نے پوچھا تھا۔ اس نے کہا تھا 'میں قمیص سلوالوں گا'... اس بات پر ہم دونوں ہنس
دیئے تھے۔ پھر وہ جب آخری بار ہسپتال میں پڑا تھا تو اس نے پوچھا تھا 'تیری وہ ساڑھی
کہاں ہے، چیک؟ مجھے اس کی قمیض سلوا دے۔ پھر پتہ نہیں...' تب مجھے احساس ہوا کہ پارک میں
اس وقت ہنسی میں کہی گئی اس کی بات میں کتنی بڑی بات تھی... سچ برتھا، میں تب بہت روئی
اس کی اس معمولی سی خواہش پوری نہ کر سکنے پر۔ تب تک میں اس ساڑھی کو پھاڑ کر اس کے
جسم کی غلاظت صاف کرنے کے استعمال میں لا چکی تھی"۔

"برتھا، کبھی تو نے اس ذہنی کیفیت کو محسوس کیا ہے؟۔ اپنے محبوب کی بے کسی کے
درد کو؟ اس درد کو محسوس کرتے ہے، دیکھ رہے اور سوچ رہے شخص کے کرب کو؟... کئی بار ایسا
ہوا۔ رات کو اشوک نیم بے ہوشی کی حالت میں بستر پر لیٹا ہوا ہے۔ میں خواب میں کوئی بھیانک چیخ
سن کر جاگ اُٹھتی ہوں۔ اشوک اُٹھنے کی کوشش کرتا ہوا کچھ بولنے کی تگ و دو میں ہے۔ میں
جلدی سے اُٹھ کر پانی کا گلاس اس کے آگے بڑھاتی ہوں۔ وہ سر ہلا کر 'نا' کہہ دیتا ہے۔ میں دوا

کی شیشی کھولتی ہوں۔ وہ روک دیتا ہے۔ میں اس کے سرہانے بیٹھ کر سر دباتی ہوں۔ وہ کچھ راحت محسوس کرتی ہے۔ پھر اشارے سے سگریٹ مانگتا ہے۔ میں سگریٹ سلگا کر اسے دیتی ہوں ... تجھے بتاؤں برکھا، جب وہ جاگا تھا، اسے سگریٹ کی طلب نہیں تھی۔ نہ ہی دوا کی ... اسے میری ضرورت تھی، میرے ہاتھوں کے لمس کی۔ میرے وجود کے نزدیک ہونے کی .... مگر وہ کہہ نہیں سکتا تھا۔ بعد میں مجھے ڈاکٹر کلارک نے بتایا کہ فالج زدہ مریض کے دل، دماغ اور جسم میں ترنگیں اٹھتی ہیں۔ مگر وہ چند سیکنڈوں کے لیے ہوتی ہیں۔ چند لمحات بعد وہ بھول جاتا ہے کہ اس نے کیا چاہا تھا۔ کس چاہت نے اسے پریشان کیا تھا .... یہ جان کر میں بہت تڑپی تھی .... پھر جب وہ کافی صحت یاب ہو گیا۔ چھڑی کے سہارے چلنے لگا تھا۔ میں اسے سوئے ہوئے کو دیکھتی رہتی تھی۔ مجھے نیند نہ آتی۔ مجھے لگتا، میرا آدھا جسم مردہ ہو کر میرے ساتھ لیٹا ہے۔ اشوک جاگ اُٹھتا۔ مجھے دیکھتا، پوچھتا 'تم سوئی نہیں رضیہ؟'... میں کہتی 'نیند نہیں آ رہی'، تب وہ حساس شخص اتنے دُکھ سے بھری نظروں سے مجھے دیکھتا کہ میں برداشت نہ کر سکتی۔ پھر وہ ایک بازو کے بل اپنے جسم کو گھسیٹ کر میرے نزدیک کرتا۔ میری چھاتی پر سر رکھ دیتا — تو سمجھتی ہے برکھا؟ اس کیفیت کو؟ ہم دونوں کی بے بسی کے دُکھ کو؟"

"اتنے دُکھی تھے تم؟"

"تھے — مگر دُکھ میں بھی ایک سُکھ ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کے دُکھوں سُکھوں میں جینے کا۔" برکھا سُن کر خاموش ہے۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی میری بات، شاید — انسان کو کتابیں نہیں تجربات زیادہ باشعور کرتے ہیں۔

"پھر بعد میں فرق بھی پڑا تمھاری محبت میں؟" وہ نیا سگریٹ سلگا کر پوچھتی ہے۔

"نہیں،" کہنے کو تو میں نے 'نہیں' کہہ دیا مگر یہ جواب پورا سچ نہیں۔ فرق اتنا باریک ہے کہ برکھا شاید ہی سمجھ سکے۔ فرق یہ پڑا کہ اشوک جب صحت مند تھا، وہ ہر وقت میرے تصوّر میں رہتا۔ اس کا چہرہ، آنکھیں، ناک، پیشانی، ابرو، ہونٹ اور ان سب کی پیاری پیاری سی حرکتیں مجھے دکھائی دیتی رہتی تھیں کبھی کتاب پر، کبھی بلیک بورڈ پر اور کبھی چلے جا رہے لوگوں کے چہروں پر۔ مگر جب اسے ایک ماہ کے بعد ہسپتال سے گھر لایا گیا تو میرے تصوّر میں سے اس کی شکل نکل گئی تھی۔ ان نقوش کو یاد کرنے کے لیے مجھے اپنے ذہن پر زور ڈالنا پڑتا تھا ... خوابوں میں بھی وہ مجھے چہرے کے بغیر ہی ملتا تھا۔ بس ایک جسم ہوتا تھا۔ جو چھُونے پر کبھی پتھّر کا بن جاتا تھا اور کبھی کسی دھات کا۔

یں برتھا کو صرف اتنا ہی بتاتی ہوں "فرق پیدا ہوتا ہے صرف اس وقت جب ایمان ٹوٹنے لگتا ہے۔ دل میں گناہ پیدا ہونے لگتا ہے... ایسے مواقع اس وقت آئے جب اشوک کی خدمت کرتی ہوئی میں خود بیمار پڑنے لگ گئی تھی۔ برتھا، میں بہت گھبرا جاتی تھی۔ اشوک کی حالت دیکھ کر۔ خود کو ٹوٹنے سے بچانے کے لیے میں دعائیں کرتی تھی۔ اشوک جاگ اٹھتا۔ مجھے دعا کرتی کو دیکھ کر مسکراتا۔ وہ مجھے یہ بتا کر حیران کر دیتا تھا کہ میں بہت گہری نیند سویا تھا۔ میں بھی خواب میں تیزی سے ہلتے اس کے اعضا کو دیکھ کر اس کا تڑپنا سمجھ کر اس کے درد کو محسوس کرتی رہتی تھی۔" میری بات سن کر برتھا ناخوش ہو گئی ہے۔ اس نے سرہانے کی طرف رکھا پانی پی کر اور سگریٹ کا لمبا کش لے کر دھواں چھت کی طرف اڑا دیا ہے۔ کچھ سوچتی ہے۔ پھر لمبا کش لے کر میری طرف دیکھتی ہوئی پوچھتی ہے "رضیہ سچ بتانا۔ تجھے کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ اشوک جی کو کسی نرسنگ ہوم میں داخل کرا کے زندگی کو نئے سرے سے شروع کرے، یا کوئی سالم و ثابت دوست کی تلاش کرے؟" مجھے برتھا کی بات بھدی لگتی ہے۔ میں جھنجھلا گئی ہوں۔ مگر میں خود کو قابو میں رکھتی ہوئی کہتی ہوں "برتھا، میں اس انسان کو اپنے آپ سے زیادہ پیار کرتی ہوں۔"

"سن کر برتھا چپ ہو گئی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بہت بدمزہ سا سوال پوچھتی ہے۔ "کیا تم اشوک کو بھی یسوع مسیح کے مطابق غریبوں، یتیموں اور اپاہجوں کی خدمت کے جذبہ کے تحت سنبھالے نہیں بیٹھی ہو؟... کیا تو یہ غیر قدرتی رویّہ یسوع مسیح کی مہر کے قابل بننے اور اس کی متصورہ جنت میں جانے کے لیے اختیار نہیں کر رکھا؟" میں اس کا کوئی جواب نہیں دیتی۔ کراس بناتی ہوں اور برتھا کے لیے دعا کرتی ہوں۔

وہ پھر بولتی ہے "مجھے معلوم ہے، اس کا جواب تو 'نا' میں دے گی۔ مگر سچائی 'ہاں' میں ہے۔ پر تو مانے گی نہیں۔" کتنا زہر ہے برتھا کی سوچ میں۔ میں خاموش رہنا ہی بھلا سمجھتی ہوں۔

تبھی اشوک جی کی آواز آتی ہے "رضیہ بھئی مجھے نیند نہیں آ رہی۔ ایک گولی دے دو۔" یا خدا۔ اشوک نے ساری باتیں سن لی ہیں۔ کیا بیتی ہو گی اس کے دل پر، برتھا کی آخری بات سن کر؟ خواہ ہے وہ بھی کافی سچ۔

شولڈر بیگ (۱)

چنڈی گڑھ کے سیکٹر سترہ کی مارکیٹ کے اس موڑ سے وندنا پر مار ابھی ابھی میرے سامنے رکشا میں بیٹھی گزری ہے۔ اس کو دیکھتے ہی مجھے 'کچھ' ہو گیا ہے۔ میں رک کر درخت کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا ہوں۔ محسوس کرتا ہوں، پر بتا نہیں سکتا کہ وہ کون سا جذبہ ہے جس نے ایک دم مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔

وندنا کے کندھے پر وہی شولڈر بیگ لٹک رہا تھا اور اس کے ساتھ وہی لمبا، گورا پروفیسر میر چندانی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اپنے نئے ناٹک کی ریہرسل کرانے کے لیے اپنے فلیٹ پر لے جا رہا ہوگا اسے۔

یہ 'کچھ ہونا'، میری فطرت نہیں۔ کوئی غیر معمولی ذہنی کیفیت ہے۔ جو کبھی کبھی ہی ہوتی ہے۔ مگر جب ہوتی ہے تو خون میں کوئی دوا سی گھل جاتی ہے۔ خون کبھی رگوں میں دوڑتا ہوا دماغ کو چڑھنے لگتا ہے اور کبھی ٹھنڈا ہو کر منجمد ہونے لگتا ہے۔

یہ 'کچھ ہونے' کی کیفیت گذشتہ ایک مہینہ سے تب سے بڑھ گئی ہے جب سے ہمارے حلقہ میں وندنا اور میر چندانی کی باتیں ہونے لگی ہیں۔

جب بھی میری ایسی حالت ہوتی ہے، میں وہ نہیں رہتا، جس کو میرے دفتر کے لوگ، احباب، رشتہ دار، میری بیوی، میرے بچے اور کافی ہاؤس کے واقف جانتے ہیں۔ میں اپنی اس حالت کو حتی الوسع چھپاتا ہوں، جو کچھ ہو جانے کے بعد میرے چہرے بشرے سے ظاہر ہونے کو آتا دکھائی ہو جاتی ہے۔ دراصل مجھے مار 'کچھ ہونے' نے اتنا نہیں جتنا 'کچھ ہونے' بارے سوچتے رہنے کی عادت نے ہے۔ یوں تو وندنا بھی اس واقعہ سے رنجیدہ ہوئی ہوگی جو بادل پھٹنے کی

طرح ہمارے درمیان آگرا تھا۔

جب سے وہ واقعہ گزرا ہے ایک خواب ہر رات حملہ آور ہونے لگا ہے۔ وہ ہے کانچ ٹوٹنے کا۔ لگتا ہے، کانچ میرے گردو پیش ٹوٹتا ہے۔ کانچ میرے اوپر ٹوٹتا ہے اور کانچ میرے اندر ٹوٹتا ہے۔ جگ، گلاس، چمنی، بوتل یا کھڑکیوں اور روشندانوں کے شیشے اگرچہ ٹوٹتے نہیں مگر ان کے ٹوٹنے کا مجھے خوف لگا رہتا ہے۔ ان کے ٹوٹنے کا دھوکہ تو ہوتا ہے، پر میری نیند نہیں ٹوٹتی۔ نیند تب ٹوٹتی ہے جب یہ خوف طاری ہو جاتا ہے کہ کانچ کے وہ ٹکڑے میرے جسم کے اعضا میں دھنس کر کہیں گم نہ ہو جائیں۔

'کچھ ہونے' کی اس حالت کا علاج میں ایسے کرتا ہوں — سوچ سوچ کر خود کو نڈھال کر لیتا ہوں۔ ان پہلوؤں کے بارے میں بھی سوچتا ہوں جو میرے مخالف وکیل نے بتانے ہوتے ہیں۔ یا پھر جسم کو کسی کام میں لگا کر اتنا تھکا لیتا ہوں کہ ٹرانکولائنزر کھا کر سونے کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں رہتا۔ پھر ہلکی ہلکی نیند کے ساتھ وہی خوابوں کی فلم پھر چلنے لگتی ہے۔

اب وہ اور میر چندانی جب میرے آگے سے گزرے تو باتیں کرنے میں اتنے مصروف تھے کہ سڑک کے عین کنارے پر کھڑا میں ان کو دکھائی نہیں دیا۔ وندنا کا چہرہ میری طرف تھا۔ اس نے مجھے دیکھا بھی تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی آئی تھی... بس اتنی سی بات نے مجھے جذباتی کر دیا۔

یہ جذباتی ہونا بھی میری فطرت میں شامل نہیں۔ رومانٹک اور جذباتی لوگوں کے ساتھ تو مجھے بیٹھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ ان کو میں بے وقوف کہتا ہوں۔ وندنا جب مجھے ملی تھی تو بے وقوف ہی تھی۔ مگر اب میں خود اپنی نظروں میں بے وقوف بنا کھڑا ہوں۔

اس 'کچھ ہونے' کو خود سے الگ کرتا ہوا میں درخت کی ٹیک چھوڑ کر سیکٹر سولہ کی طرف چل دیا ہوں..... یہ 'کچھ' سالا کیا ہے؟ یوں ہی غصہ سا، حسد سا نفرت سی، کوئی خوف سا... اور پتہ نہیں کیا کیا سا۔

یہ کیوں؟ اس کو دو لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے... وندنا جب میری کم آمیز فطرت کو توڑتی پھوڑتی ہوئی میرے پاس آ بیٹھی تو میں نے سوچا تھا، یہ جاتی کیوں نہیں؟ پھر ایک دن ایسا

آیا، یہ جانے لگی تو میں نے سوچا، یہ جاتی کیوں ہے؟

یا ایسے بھی کہا جا سکتا ہے — وہ مجھے جب کافی ہاؤس میں ملی تھی تو اس کے شولڈر بیگ میں میری کہانیوں کی کتاب تھی اور ماہنامہ 'نیل کنٹھ' کا شمارہ۔ جس کا میں ملازم ایڈیٹر ہوں۔ پھر اس شولڈر بیگ میں میری ہی تحریریں تھیں — پھر وہ چیزوں سے بھرا ہوا میرے کمرے میں آتا اور خالی ہو کر لوٹ جاتا تھا۔ پھر ایک دن وہ شولڈر بیگ میر چندانی کے فلیٹ میں سے بھرا پڑا ہو کر میرے دفتر آگیا — اور پھر ایک دن میر چندانی کے فلیٹ میں ہی رہ گیا — اب اس شولڈر بیگ میں صرف اُس میک اپ کا سامان ہوتا ہے جس کے استعمال سے میر چندانی کی ڈائریکشن میں کھیلے جانے والے ناٹک کی ریہرسل کی جا سکے۔

میں اب اپنے دفتر نہیں جاؤں گا۔ سیکٹر پندرہ کی طرف چل پڑا ہوں — وندنا ہماچل کے ایک گاؤں سے آئی ہے۔ جہاں اس کے شوہر کی لکڑی کی پیٹیاں بنانے کی فیکٹری ہے۔ وہ جب بھی آتی، مجھے ڈھونڈ ہی لیتی۔ کبھی کافی ہاؤس میں، کبھی سیکٹر پندرہ میں میری چھوٹی سی برساتی میں۔ اور کبھی اس پُل پہ کھڑی ہو کر مجھے دفتر جا رہے کو دبوچ لیتی تھی۔

کبھی کبھی میں بھی دفتر سے آتا ہوا اس پُل پر بیٹھ جاتا تھا، اس کے انتظار میں۔ اس پُل سے ہم روز گارڈن کی طرف چلے جاتے تھے۔ جہاں بیٹھ کر وہ اپنی نظمیں سناتی تھی۔ اس کی نظموں میں پھولوں کے کھلنے، سورج کے طلوع ہونے، غروب ہونے، چاندنی کے دکنے، دوستوں کی محبت یا ان کے بغیر روح کے زنگ آلودہ ہو جانے کا ذکر ہوتا تھا۔ مجھے وہ سب رومانٹک سی باتیں اچھی نہیں لگتی تھیں۔ میں اس کے ملائم الفاظ کی شاعری سے جلدی اُکتا جاتا تھا۔ مگر میں نظموں کو 'بُری' نہیں کہتا تھا۔ میں وندنا کو یوں ہی ناراض کر کے اس کی خوشگوار صحت کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ مگر میں جھوٹی داد بھی نہیں دیتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ شاعرہ نہیں بن سکتی۔ میں باتوں کا رُخ بدل کر اس سخت زندگی کو سمجھنے کی بات کرتا تو وہ میرے چہرے پر نظر ٹکا لیتی۔ لگاتار دیکھتی رہتی۔ میں گھبرا جاتا۔ دل کو عجیب سی تشنگی محسوس ہوتی۔ میں ایک دم اُٹھ کر کھڑا ہو جاتا۔ کہتا۔ ''چل اب چلیں یہاں سے۔''

یہ تشنگی سی تب نہیں محسوس ہوئی تھی جب وندنا پہلی بار مجھے کافی ہاؤس میں ملی تھی۔ تب

اس کے عام سے چہرے پر خلوص نمایاں تھا۔ تب کیا پتہ تھا کہ وہ چہرہ اتنے رنگ بدلے گا اور اس کے شولڈر بیگ میں میری تحریروں کی جگہ میک اپ کا سامان بھر جائے گا۔

اس نے اپنے شولڈر بیگ میں سے کچھ نظمیں نکال کر میرے آگے رکھ دی تھیں۔ جن کو پڑھ کر اور اس کے منہ سے بولا جا رہا لفظ 'یار' سن کر مجھے محسوس ہوا تھا کہ اس عورت میں جرأت ہے۔ یہ کچھ کر سکتی ہے۔ کچھ بننا چاہتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ یہ ستار بجائے، پینٹنگ کرے اور انٹلیکچول کہلائے ـــ اور کچھ ہی دنوں بعد میرا یہ قیاس ٹھیک نکلا تھا۔

ہاں' اس موڑ پر وہ بات ہوئی تھی، جس نے اس واقعہ کے بیج کو جنم دیا تھا، جسے میں بادل پھٹنا کہتا ہوں ـــ اس موڑ پر ایک روز میں نے اس کی نظم سننے کے بعد کہا تھا۔ "چھوڑو رومانٹک سی باتیں۔ مجھے یہ سب اچھی نہیں لگتیں۔"

"اور کیا اچھا لگتا ہے؟" اس نے میرے چہرے پر نظریں جما کر پوچھا تھا۔

"تُو..." مجھ سے بے اختیاری کے موڈ میں کہا گیا تھا۔

"اور کیا اچھا لگتا ہے؟" اس نے نظریں ہٹائے بغیر پوچھا تھا۔

"تیرا سب کچھ ـــ تجھے دیکھنا، تجھے سُننا، تجھے سونگھنا، تجھے چھونا۔" میں بولتا رہا تھا۔

"بس۔س۔س؟"

"ہاں، بس۔" میں نے کہہ دیا تھا۔ اور کہہ کر گھبرا گیا تھا۔ دراصل میں اس کی 'بس' کا مطلب سمجھا ہی نہیں تھا۔ میرے حیران سے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے میری نقل اُتارتے ہوئے کہا تھا۔ "مجھے یہ رومانٹک سی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔"

وندنا جب بھی مجھے ملنے آتی، کچھ لے کر آتی۔ موقع ملنے پر وہ اپنے شولڈر بیگ میں سے وہ چیزیں نکال کر میری چھوٹی سی میز پر ٹکا دیتی۔ کبھی کوئی خوبصورت سا رومال ہوتا، کبھی تولیہ، کبھی پین ہوتا اور کبھی کوئی ڈیکوریشن پیس۔ میں اسے ایسا کرنے سے روکتا۔ کبھی کبھی جھلّا اٹھتا۔ مگر وہ نہ مانتی۔ کبھی کبھی میں اس کی محبت کے نیچے دبا دبا سا محسوس کرتا۔ مگر اسے دیکھ کر اس کی ضِدّ مان لیتا۔

دراصل وہ مجھے دبانے کا گُر جان گئی تھی۔ ایک بار وہ کئی روز کے بعد آئی۔ مجھے اس کا

انتظار نہیں تھا۔ میں کرسی باہر نکال کر آدھے چاند کی چاندنی میں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ رات کے نَو بجے ہوں گے۔ اچانک دروازہ کھلا۔ دروازے کی طرف میری پیٹھ تھی۔ میں نے پاؤں کی چاپ سے ہی اسے پہچان لیا۔ اس نے مجھے حیران کرنے کے لیے میرے کندھوں پر اور اپنے بازوؤں سمیت گرم چادر پھیلا دی۔ اور اپنا سر میری گردن سے لگا دیا۔ کچھ بھی بولے بغیر ہم اسی پوزیشن میں رہے۔ ہمارے جسم ایک دوسرے کی گرمی محسوس کر رہے تھے۔

پھر ہم اندر جا بیٹھے تھے۔ میں سگریٹ سُلگا کر چارپائی پر لیٹ گیا تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھی مجھے دیکھتی رہی تھی۔ — محبت بھرے اس پل میں اچانک ایک دُکھ اُبھر آیا تھا۔ میں نے اپنی وہ کتاب اُٹھالی تھی، جس میں وہ ایک ماہ پہلے ایک سو روپے کا نوٹ چھپا کر رکھ گئی تھی۔ پتہ چلنے پر مجھے اس کی وہ حرکت بری لگی تھی۔ میں غریب سہی، پر کسی سے اس طرح کچھ لینا مجھے بالکل پسند نہیں۔ وہ نوٹ دیکھ کر تو مجھے محسوس ہوا تھا کہ وہ وندنا خوش کرتی ہوئی مجھے خریدنے لگی ہے۔ شاید اس کے دل میں یہ بات نہ ہو مگر مجھے ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ کچھ دے کر مجھ سے کچھ لینا چاہتی ہے۔

کرسی سے اُٹھ کر آئینے کے سامنے جا کر اس نے اپنے بال سنوارے۔ میک اپ کیا۔ بِنریا گول کرتے ہوئے اس نے پوچھا تھا "تھیں گرمی نہیں لگتی؟" کہہ کر اس نے پنکھا ہلکی رفتار سے چلا لیا اور کھڑکیوں کے پردے پھیلا دیئے تھے۔ کھڑی ہو کر میری طرف دیکھ کر مسکرائی تھی۔ میرے پاس آکر میری چارپائی کی پائٹی پر بیٹھ کر اپنی نئی نظم سنانے لگی تھی۔

اس کی وہ بیسویں نظم بھی پہلی ہی جیسی تھی۔ وہی پھول، وہی پیار، وہی روح کسی انجانی چیز، کسی ناقابل قیاس جذبے کے لیے تڑپتی ہوئی۔ میں ایک دم جھنجھلا گیا تھا۔ مگر کسی اُلجھے سے جذبے کے تحت میں نے اسے داد دی تھی — مگر ایسا کرتے ہوئے مجھے محسوس ہوتا رہا تھا کہ میں بھی کسی کوٹھے والی سے کم ہوں کیا؟ میں بھی وہی کرتا جا رہا ہوں، جو میں نہیں چاہتا۔ کوٹھے والی کا بھی یہی المیہ ہوتا ہے۔ اسے وہ کچھ کرنا پڑتا ہے جو وہ نہیں چاہتی۔ اس کے عوض اسے پیسہ ملتا ہے اور مجھے ؟؟؟ —

تب بھی میری ذہنی کیفیت ویسی ہی ہوتی ہے جب میں اپنے دفتر کے مالک کے سامنے کھڑا

ہوتا ہوں ــــ وہ مجھے کوئی نظم دے کر کہتا ہے 'یہ شائع کر دیں' ــــ مجھے معلوم ہوتا ہے وہ نظم اس کی کسی 'کمزوری' کی ہوتی ہے۔ وہ کبھی کوئی کہانی دیتا ہے تو انگوٹھے اور اس کی ساتھ کی انگلی کو جوڑ کر کہتا ہے 'بس نگینے کی طرح جڑ دو' ــــ میں سمجھ جاتا ہوں، یہ کہانی لچر ہے۔ اسے ڈسپلے اچھی دینی ہے۔

مالک کی بات کتنی بھی احمقانہ سہی، ماننی پڑتی ہے۔ کئی بار مالک کو بھی پتہ چل جاتا ہے کہ اس کی بات میں کوئی تک نہیں۔ مگر وہ ضد میں منوائے جاتا ہے۔ شاید اسی میں میرے ملازم ہونے کا دکھ اور اس کے مالک ہونے کا سکھ چھپا ہوا ہے۔ جیسے کوئی اپنے سے بہت زور آور شخص کو نیچے دبائے بیٹھا اپنی فتح کا لطف لے رہا ہو۔

میرا مالک پرچے میں شائع کرنے کے لیے مجھے جو کچھ دیتا ہے، میں اسے پڑھنا بھی نہیں چاہتا۔ مگر میں سب کچھ کرتا ہوں ــــ جیسے وندنا کو داد دیتا ہوں ــــ پہلی بات ناچ میں بیٹھے اپنے کنبے کے لیے اور دوسری میری ذہنی آسودگی کے لیے ضروری ہے۔ پھر بھی اکثر مجھے محسوس ہوتا رہتا ہے کہ یہ جسم فروشی ہے، دماغ فروشی بھی اور ضمیر فروشی بھی۔ ــ کئی بار لگتا ہے کہ یہ ایڈیٹری کرنا، نظم یا کہانی لکھنا، تصویر بنانا اور کسی کی محبت میں ڈوب جانا اپنی ہر قسم کی کمزوریوں اور کوتاہیوں سے پیدا ہونے والی اذیت کا چارہ ہی تو ہے۔

"آج بولنا نہیں؟" وندنا نے میرے اوپر جھکتی ہوئی نے پوچھا تھا۔ اور سگریٹ والا میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے منہ کو لگا لیا تھا۔ میری جھنجھلاہٹ ڈھیلی پڑنے لگی تھی۔ مجھے یونہی خیال آ گیا تھا کہ شاید وہ ایک رات کا قرض لوٹانے آئی ہے۔ 'نیل کنٹھ' کے تازہ شمارہ میں اس کی رومانٹک سی نظم شائع ہوئی تھی، اس کی فوٹو سمیت۔

پھر پتہ نہیں کیوں، شاید میرے چہرے سے میرے اندر کی الجھن کو بھانپ کر اس نے میرا ہاتھ ایک دم چھوڑ دیا تھا۔ اور تڑپ کر چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ تیزی سے اپنا شولڈر بیگ اٹھا کر کچھ بھی کہے سنے بغیر چلی گئی تھی۔ میں چاہتا ہوا بھی اسے روک نہیں سکا تھا۔ میری سوچ کو، میرے جسم کو میری ذہنی الجھن نے بے جان کر دیا تھا۔

مارکیٹ والے چوک میں سے گزر رہا ہوں۔ آسمان پر بادل اچانک گھر آئے ہیں۔ پتہ نہیں

کیوں مجھے ایسا موسم دیکھ کر گھبراہٹ سی ہونے لگتی ہے۔ 'کچھ ہونے' کے بعد اور روشنی کم ہونے سے میرا دل گھٹنے لگتا ہے۔ میں تیزی سے اپنی برساتی کی طرف چل دیا ہوں۔

اس چھوٹے سے پارک میں، اس پاپلر کی چھاؤں میں وندنا نے مجھے اپنی نظم آخری بار سنائی تھی۔ جس میں دھند والی ایک شام کی مدھم سی روشنی میں چلتے ہوئے دو انسانوں کی پرچھائیں کا ذکر تھا — وہ سنا رہی تھی تو میں سوچ رہا تھا کہ میرا رومانٹک ہو کر جینا بھی مشکل ہے اور سچائی کو سمجھ کر بھی۔ مجھے دونوں حالتوں میں مرنا ہے — کانچ نے میرے اندر ٹوٹنا ہے، اور اندر ہی کہیں کھو جانا ہے۔ بھرے سیکٹر کی اس آباد سڑک پر سر اور بازوؤں کے بغیر میرا دھڑ چلا جا رہا ہے۔ چلتے ہوئے مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ اس نے خون گرم رہنے تک چلنا ہے۔

اپنی برساتی کا دروازہ کھولتا ہوں۔ لگتا ہے صدیوں سے ویران پڑے کسی بھوت بنگلے کا دروازہ کھلا ہے۔ یہاں کی ہوا میں مدت سے بند پڑے مکان کی نمدار بو ہے۔ خود کو کرسی پر ٹکا کر میں دروازے کی طرف دیکھتا ہوں۔ — ایک روز میں نے اسے دروازہ میں روک کر کہا تھا: "جی چاہتا ہے، تجھے اپنے پاس ہی رکھ لوں۔"

"تو رکھ لو پھر۔" اس نے اپنا شولڈر بیگ میز پر رکھ کر کرسی پر نیم دراز ہو کر کہا تھا۔

"اچھا تو رہ جاؤ۔"

"ہمیشہ کے لیے۔"

"ہاں ہمیشہ کے لیے۔"

"پہلے نابھے والی سے تو پوچھ آ۔" اس نے میری بیوی کی بات کرتے ہوئے کہا تھا۔

یہ بات کہنے کو تو مذاق میں کہی تھی۔ سننے میں لگتا بھی ایسا ہی تھا۔ مگر کہی اس نے دل سے تھی۔ اس بارے میں اس نے ایک نظم بھی لکھی تھی۔ ایسا ہو سکتا ہے، ایسا مجھے ہی محسوس ہوا ہو یا اس کا یہ احساس گھڑی پل کا ہی ہو۔ مگر یہ بات سچ ہے کہ ان دنوں وہ اپنے شریف اور ہر وقت پیسہ کے بارے میں سوچنے والے شوہر کو چھوڑنے کی انڈوینچر کرنے کو آمادہ تھی۔ — اس سلسلے میں وہ مجھے بزدل کہتی تھی، مگر ہمدردی کے ساتھ۔

مگر اس نے یہ کیا غضب کیا؟ میں اتنے دکھ سے بھرا پڑا ہوں اور وہ میر چندانی کے ساتھ

ناٹک کھیلتی پھرتی ہے۔ ہاں، یہ سچ ہے کہ میر چندانی نے اسے ایکٹریس بھی بنا دیا ہے۔ستار نواز بھی اور پینٹر بھی ۔مگر میں اسے کچھ بھی نہ بنا سکا۔

کرسی پر بیٹھا میں کمرے کا جائزہ لیتا ہوں، دیکھتا ہوں، اس کمرے میں کتنا کچھ میرا ہے اور کتنا کچھ وندنا کا؟... میز پر پڑا پلاسٹک کا قلمدان، ریک میں پڑی ڈکشنری، تکیے کا غلاف، دیوار پر ٹنگی پینٹنگ، الماری میں پڑی گرم چادر... مجھے جھنجھلاہٹ سی ہوتی ہے اس کی ہر چیز پر۔

میں وہ تمام چیزیں اکٹھی کر کے گرم چادر میں ڈال لیتا ہوں۔ باہر چھت پر لے جاتا ہوں۔ تمام چیزوں کو ایک ایک کر کے دیکھتا ہوں۔جیب میں سے ماچس نکال کر تیلی نکالتا ہوں۔ جلا کر ان پر رکھتا ہوں۔ آگ لگتی نہیں ہے۔ مجھے کسی کے آجانے کا ڈر محسوس ہوتا ہے... اُٹھ کر دروازہ کی چٹخنی لگا دیتا ہوں۔ اندر سے مٹی کے تیل کی بوتل لا کر ان چیزوں پر چھڑک دیتا ہوں۔ ہر چیز جلنے لگتی ہے۔جل کر مُڑ تُڑ رہی ہے۔ بھدّی بُو پھیل گئی ہے... بادل اور گہرے ہو گئے ہیں۔ تمام چیزیں ٹیڑھی میڑھی ہو کر راکھ کی ڈھیری بن جاتی ہیں۔میں بے لگاؤ سا کھڑا سب کچھ کو دیکھ رہا ہوں۔کوئی کوئی بوند گرنے سے گرم راکھ میں سے ٹھس ٹھس کی آواز آتی ہے... مجھے لگتا ہے۔'کچھ ہونے' سے میں راستہ پر چل پڑا تھا، اس کا ایک موڑ آگیا ہے۔میں مُڑ رہا ہوں... میں تیزی سے وہ راکھ اکٹھی کر کے کنستر میں ڈال کر ایک طرف رکھ دیتا ہوں۔

کتنی گھٹن ہے اس کمرے میں۔ لگتا ہے اس پر کانچ گر چکا ہے... اس کمرے میں انسانی جسم کے جلنے کی بُو ہے۔

میں دروازہ بند کر کے تالا لگائے بغیر باہر نکل جاتا ہوں۔سڑک بالکل ویران ہے۔بوندا باندی ہو رہی ہے... سر، گردن، عینک اور ہاتھوں پر گرتی بوندیں محسوس کرتا ہوا چلا جا رہا ہوں... مگر پتہ نہیں، کس طرف؟ کہاں جانا ہے میں نے؟

اس بس اسٹاپ پر ٹیگور تھیٹر کی طرف جانے والی بس کا انتظار کرتے ہوئے میں نے وندنا سے کہا تھا ایک بار "اس رات اگر تو مجھے مل جاتی تو... میں تجھے مار ڈالتا۔"

"تُو مجھے مار سکتا ہے؟" اس نے میرا چہرہ دیکھتے ہوئے ایسے پوچھا تھا جیسے کوئی ناممکن بات سُن لی ہو۔

"ہاں۔ مگر اب نہیں — تب مار سکتا تھا، جب میں تجھے ڈھونڈ رہا تھا۔۔۔۔ میں رات کے دس بجے تک تیرا انتظار کرتا رہا تھا، اس سڑک پر۔ یہ خیال تھا، تو یہاں سے گزرے گی۔"

"میں گزری تھی۔ میں تھری وہیلر پر تھی۔ میں نے تجھے چوک میں کھڑے دیکھا بھی تھا۔ میں نے رکنا بھی چاہا تھا۔ مگر مجھے دیر ہو گئی تھی۔ کافی ہاؤس میں بیٹھی رہی تھی، تیرے دوست کے انتظار میں — تو ہی آجاتا تو کتنا اچھا لگتا۔" اس نے میر چندانی نہ کہہ کر 'تیرا دوست' کہا تھا۔ شاید مجھے چڑھانے کے لیے۔

"تو جھوٹ بولتی ہے۔ تو کافی ہاؤس میں نہیں تھی۔ میں تجھے دیکھنے وہاں بھی گیا۔ مجھے پتہ چل گیا تھا۔ تو اس کے ساتھ 'ڈین' میں بیٹھی تھی۔"

"تجھے اتنی تلاش تھی میری؟" اس نے یہ بات ایک ہی سانس میں کہی تھی۔ اور میرے چہرے کی طرف دیکھتی ہوئی بولی تھی: "لے اب مار دے مجھے۔" اس نے اپنی گردن میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔

تبھی بس آ گئی تھی اور ہم تیزی سے سوار ہو گئے تھے۔

بس میں ہم دونوں چپ رہے تھے۔ میرے اندر کوئی کہہ رہا تھا — 'اب یہ ایک اور — ہماری آخری ملاقات ہو گی۔۔۔ اور زندگی کی سچائی کی تلاش میں پاگل ہوئے میرے ذہن میں ہجر کے رومانٹک سے دکھ کے جذبات کے ٹکڑے چیونٹیوں کی طرح گھومنے لگے تھے۔

بس سے اتر کر ٹیگور تھیئٹر کی طرف جاتے ہوئے میں نے آخری داؤ کھیلتے ہوئے کہا تھا: "تجھ پر میری ایک رات کا قرض ہے۔"

"تھا، مگر اب نہیں۔" میری طرف دیکھے بغیر کہہ کر وندنا میک اپ روم میں چلی گئی تھی۔ اور باہر کھڑا میں وہ دن یاد کر رہا تھا جب میری برساتی کی سیڑھیاں اترتے ہوئے وندنا نے کہا تھا: "آج جانے دے۔ پھر کبھی آؤں گی۔"

"پھر بھی ایسی ہی آئے گی۔ گھڑی پل کے لیے۔"

"اور تو کیا چاہتا ہے؟" اس نے رک کر پوچھا تھا۔

"کبھی ایک رات رک جاؤ۔"

"صرف ایک رات... ؟"

"ہاں۔ صرف ایک رات... کبھی بھی... جب بھی تو چاہے۔ سن وندنا۔ مجھے ایک رات دے دے، اپنی بیش قیمت زندگی میں سے... صرف ایک ہی رات... کبھی بھی..."

"اچھا۔ دی... دے دی۔ مگر تو اس طرح ہاتھ نہ جوڑا کر۔ مجھے تکلیف ہوتی ہے۔" کہتے ہوئے اس نے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر ہونٹوں کو لگا لیے تھے۔

لیکن 'وہ رات' نہ آئی۔ اور ہمارے درمیان واقعات کا وہ سلسلہ شروع ہو گیا، جس کی شروعات بادل پھٹنے کی طرح گزرے واقعہ سے ہوئی تھی۔

دراصل میر چندانی مجھے آواز دیتا ہوا اوپر آ گیا تھا۔ وہ ولائت سے جب بھی آتا تھا' پہلے مجھے ڈھونڈتا تھا۔ ایک رات کا جشن میرے ساتھ مناتا پھر گھر والوں کو ملنے جاتا تھا۔ سیڑھیوں میں مجھے گالیاں بکتا ہو آیا تھا۔ پھر وندنا کو دیکھ کر ایک دم رُک گیا تھا۔

پھر وہی باتیں کرتے رہے۔ اور مجھے اپنے دل، دماغ اور جسم کو چائے بنانے اور کچھ کھانے کے لیے پکانے لگانا پڑا تھا۔

وندنا چلی گئی تو میر چندانی نے پوچھا تھا: "یہ کیا بیماری ہے؟"

"بیماری نہیں۔ اچھی عورت ہے۔"

"اچھی تو ہو گی، مگر ہے کیا شے؟... شاعرہ ہے؟ کہانی کار ہے؟ ایکٹرس ہے یا خوبصورت انٹلیکچول۔"

"ابھی کچھ بھی نہیں۔ کچھ بننے کی کوشش میں ہے۔" کہتے ہوئے میں نے ایسے ظاہر کیا تھا جیسے اس کے ساتھ میرا کوئی خاص تعلق ہی نہ ہو۔

چند روز کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میر چندانی تو اس کا گاؤں بھی دیکھ آیا۔ کئی روز کے بعد وندنا میرے دفتر میں آئی تو اس کے پاس میر چندانی کی تعریف کے سوا اور کوئی بات ہی نہیں تھی۔ "وہ تو جینئس ہے۔ بائی گاڈ، اے بورن جینئس... تو کتنا اچھا ہے۔ تو نے مجھے اس سے ملا دیا۔ تھینک یو۔ تیرا شکریہ۔" کہتے ہوئے اس نے میری طرف بہت احسان مندی سے دیکھا تھا۔

"تجھے بہت بھا گیا ہے، وہ بھورے بالوں والا ایکٹر؟"

"ہاں۔ بہت۔" وندنا نے بڑی سادگی سے کہا اور اپنے شولڈر بیگ میں سے چیزیں نکال کر میرے آگے رکھ دی تھیں، جو میر چندانی نے اسے بطور تحفہ دی تھیں۔ ان میں رنگوں کی ولایتی ٹیوبیں تھیں۔ سینٹ کی ایک شیشی تھی۔ ایک ریشمی اسکارف تھا اور پامسٹری کے موضوع پر ایک کتاب۔ وندنا مجھے وہ چیزیں دکھاتی ہوئی ان کو چھوتی ہوئی اور ان کی باتیں کرتی ہوئی ایسے لگ رہی تھی جیسے نظم سنا رہی ہو... اس کی یہ بات مجھے کتنا پریشان کر رہی تھی... اور مجھے پتہ تھا کہ میر چندانی اسٹیج کا آدمی ہے۔ اسے کسی بھی عورت کو پاگل کرنے کے گُر آتے ہیں۔

ایک دم پتہ نہیں مجھے کیا ہوا۔ میں نے اس کی تمام چیزیں میز سے اُتار پھینکیں۔ منہ میں کچھ بڑبڑایا۔ تیزی سے دفتر سے نکلا اور چوک میں سب سے آگے کھڑے تھری وہیلر میں بیٹھ کر چلا گیا۔

بس اتنا سا واقعہ تھا جو ہمارے درمیان بادل پھٹنے کی طرح آ گرا تھا اور پتھر کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ اس واقعہ کے بعد مجھے وہ خواب دکھائی دینے لگے تھے جن میں کانچ ریزہ ریزہ ہو کر ٹوٹتا تھا اور میرے جسم میں دھنس کر کہیں گم ہو جاتا تھا۔

میں سیکٹر پندرہ کی مارکیٹ کے ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھا ہوں... یہ جگہ کتنی گندی ہے۔ اس کی گندگی کا احساس تب بڑھ رہا ہے جب مجھے وندنا کی وہ حرکت یاد آتی ہے۔ —جب اس نے آنکھیں سُرخ کر کے کہا تھا: "اگر تُو ایسا سمجھتا ہے تو ایسا ہی سہی۔" اور اُٹھ کر اپنا شولڈر بیگ جھُلاتی ہوئی نکل گئی تھی۔

مجھے لگتا ہے، 'کچھ ہونے' کی ذہنی کیفیت ابھی ٹوٹی نہیں۔ میں اُٹھ کر سڑک پر چل پڑا ہوں۔ بادل بکھر گئے ہیں۔ دُھوپ نکل آئی ہے۔ سڑک پر اسکولی بچّے اپنے رنگ برنگے سائیکلوں پر جا رہے ہیں۔

میں اپنے کنوارے دوست کے فلیٹ کی بالکونی میں آ کر بیٹھ گیا ہوں۔ سڑک پر آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہا ہوں۔ کبھی تھک کر آنکھیں بند کر لیتا ہوں اور کچھ دیر پہلے دُکھ کے گھلنے یا پگھلنے کا جو عمل ہوا تھا اس کو محسوس کرتا ہوں۔ یہ درد پیدا کس تیزی سے ہوتا ہے مگر جاتا کتنی دھیمی چال سے ہے۔

آنکھیں کھولتا ہوں تو وہ سامنے سے گزرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ میر چندانی کے لمبے بھورے بال ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ وندنا نے اپنی آسمانی رنگ کی ساڑھی کا پلّو اُڑنے سے بچانے کے لیے آگے کی طرف پھنسایا ہوا ہے۔ اس کا شولڈر بیگ بھی آگے پیچھے ہو رہا ہے۔

اب وہ بالکل میرے نزدیک سے گزر رہے ہیں، مگر انھیں کسی بھی طرف دیکھنے کی فرصت نہیں۔

"دیکھا۔ کتنے اچھے لگتے ہیں وہ اِکٹھے جاتے ہوئے۔ اُڑتے پرندوں کی طرح" میرا دوست شیو کرتا ہوا اُٹھ کر کہتا ہے۔

"ہاں۔ بہت اچھے ... مگر..." میرے بولنے پر میرا دوست میرے چہرے کی طرف دیکھتا ہے۔ وہ "مگر" سے آگے کی بات سُننا چاہتا ہے۔ پر میں بولتا نہیں۔ اپنے دل میں کہہ لیتا ہوں۔ "یہ سب رنڈی بازی ہے" اور آنکھیں میچ لیتا ہوں۔

شولڈر بیگ (۲)

پیارے کہانی کار

میں نے تمہاری کہانی 'شولڈر بیگ' آج صبح اس وقت ہی پڑھ لی تھی جب ڈاک میں 'نیل کنٹھ' کا تازہ شمارہ آیا تھا۔

میں اسی وقت اپنا ردِّ عمل لکھنا نہیں تھی چاہتی۔ اگر لکھ دیتی تو وہ ایسا ہی ہوتا جیسا کہ تو نے اپنی کہانی میں 'وندنا' کا نام دے کر میرے بارے میں لکھا ہے۔ مجھے غلط رنگ میں پیش کیا ہے۔ تیری کہانی میں معلوم ہوتا ہے کیسی عورت کا کردار اُبھرتا ہے؟ ... اس کے ذریعے تُو نے مجھے چلتی پھرتی عورت، کم عقل اور بے وفا ثابت کیا ہے ... اپنے گریباں میں جھانک کر بتا، کیا میں ایسی ہوں؟ کیا تیری وہ کہانی مجھے ان لوگوں میں بدنام نہیں کرے گی جو تیرے اور میرے تعلقات کو جانتے ہیں؟

خیر، اب شام ڈھل گئی ہے۔ کہانی پڑھے کئی گھنٹے بیت چکے ہیں۔ میں چھٹّی یونیورسٹی کیمپس

میں تیرے دوست میر چندانی کے فلیٹ کی بالکونی میں بیٹھی لکھ رہی ہوں... یہ شاید اب بھی لکھ نہ پاتی، اگر بارش نہ ہو رہی ہوتی۔ میر چندانی جالندھر گیا ہوا ہے، اپنے داڑھی والے گنجے شاعر سے ملنے۔ میں انتظار کر رہی ہوں کہ بارش رکے تو میں یہاں سے نکلوں۔ اگر تجھے 'تیرا دوست' لکھا ہوا پڑھنا اچھا نہیں لگتا تو اسے 'میرا دوست' لکھا پڑھ لینا۔

اگر میں ذاتی طرفداریوں سے بالا ہو کر سوچوں تو کہہ سکتی ہوں کہ تیری یہ کہانی اچھی ہے۔ تجھے کہانی لکھنا آتا ہے۔ تو گزرے واقعات، ہوئی باتوں، دیکھے خوابوں، تصوّر میں چلتی زندگی اور سُنی پڑھی کہانیوں کو ملا کر اچھی کہانی گھڑ لیتا ہے۔ مگر سچائی جسے تو زندگی کی حقیقت کہہ کر فخر محسوس کرتا ہے، وہ تیرے ہاتھ نہیں آتی۔ مجھے تو پہلے بھی کئی بار لگا ہے اور یہ کہانی پڑھ کر تو میرا یقین پختہ ہو گیا ہے کہ جس کو تو حقیقت یا سچ کہتا ہے، وہ تیرا اپنے من میں پالا ہوا بھرم ہے۔ تو اس بھرم کو سچ مان کر، سوچ سوچ کر اتنا بڑا کر لیتا ہے کہ وہ تجھے سچ مچ کی حقیقت دکھائی دینے لگتی ہے۔ تُو نے میرے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ ویسا ہی سچ سا کچھ ہے۔ تُو نے شولڈر بیگ والی کو کتنی رومانٹک سی، کافی ہاؤسوں میں آرٹسٹوں کے پیچھے پیچھے پھرنے والی بنا دیا ہے۔ یہ کتنا بڑا جھوٹ ہے... میں شعر کہتی ہوں۔ ٹھیک۔ مگر میں نے تجھے کب کہا تھا کہ مجھے شاعرہ بنا دو... تیرے جیسا مجھے بنا ہی کیا سکتا ہے، جو خود بھی ادھورا ہے... تو خود ہی تو کہا کرتا ہے کہ آرٹسٹ بنائے نہیں جا سکتے۔

دراصل یہ سب کچھ تیری ذہنی گانٹھوں کا پیدا کیا ہوا ہے۔ تیرے بارے میں تیرے ایک نقّاد دوست نے ٹھیک ہی لکھا ہے... تو اپنی کہانیوں میں بھی کرداروں سے بدلہ لیتا رہتا ہے۔ جب کوئی کردار تیرے ہاتھوں نیک بننے لگتا ہے تو تیرے اندر بیٹھا حاسد شخص جل جاتا ہے۔ تو اسی وقت اسے پنکچر کر دیتا ہے۔ سوئی مارنے کی یہ بدعت تجھے خود کو بھی بخشنے نہیں دیتی۔

ایسا لگتا ہے، تیرے اندر کئی زہر گھلے پڑے ہیں۔ کسی سے لگاؤ یا محبت کے جذبات بھی تیرے ان زہروں سے ہی وجود پاتے ہیں... اس بات پر مجھے تجھ پر غصہ بھی آتا ہے اور ہمدردی بھی ہوتی ہے۔

اس کہانی میں تُو نے وہ باتیں کیوں نہیں لکھیں، جن سے تیرا گھٹیا پن ظاہر ہوتا ....
تُو نے لکھا ہے، اس کے شولڈر بیگ میں میری کہانیوں کی کتاب تھی .... اس نے اپنے شولڈر بیگ میں سے نظمیں نکالیں اور میرے سامنے رکھ دی تھیں۔

یہ کتنا بڑا جھوٹ ہے۔ ویسے مجھے معلوم ہے کہ تُو نے کہانی بنانے کے لیے یہ سب کچھ لکھا، مگر میں تجھے سچائی کا احساس دلانے کے لیے یہ لکھ رہی ہوں۔ جھوٹے کہیں کے۔ تجھے ملنے سے پہلے تو مجھے پتہ ہی نہیں تھا کہ تو کہانی بھی لکھتا ہے۔ اور ایک ادبی پرچے کا ایڈیٹر بھی ہے۔ مجھے تو تُو ویسے ہی اچھا لگا تھا۔ کافی ہاؤس میں تجھے مِل کر تیرے ساتھ دو باتیں کر کے مجھے بھانے لگا تھا تو۔ مجھے تو چھوٹے شہر کا سچا اور بھولا، ایماندار شخص لگا تھا۔ اس وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ تُو اتنا تنگ دل اور کم ظرف نکلے گا ... تُو نے ایک دن میرے لیے بھی یہی الفاظ استعمال کیے تھے نا؟ ... یاد ہے تجھے؟ یہ بات تُو نے تب کہی تھی جب تو میرے منہ سے میرے خاوند کی برائی سن کر تڑپ گیا تھا۔ تو پاکھنڈ کرتا ہوا اسے اچھا آدمی کہے جا رہا تھا اور میں تجھے سمجھاتی رہی تھی کہ اس کا اچھا ہونا ہی میرے لیے دُکھوں کا سبب بنا ہوا ہے ... پھر تو ایک دم اپنا موڈ بدل کر مجھے اپنے برساتی میں لے جانے کے لیے زور دینے لگ گیا تھا۔ تُو نے وہ اپنی گھٹیا سوچ اس کہانی میں بھی لکھ دی ہے۔ تجھے پتہ ہی نہیں کہ عورت اور مرد کے درمیان کوئی اور رشتہ بھی ہوتا ہے۔ دوستی کی بھی کوئی سطحیں ہوتی ہیں۔ تو تو صرف یہی جانتا ہے کہ دو ہی رشتے ہوتے ہیں ــ محبت کا یا نفرت کا۔ میرے اور میر چندانی کے درمیان جو رشتہ ہے وہ ایک خاص سطح کی دوستی ہے ... چلو چھوڑو ... یہ بات تیری سمجھ میں نہیں آئے گی، کاہے کو بحث میں اُلجھنا ہے۔

میں چاہتی ہوں کہ کسی روز تجھے ٹرُوتھ سیرم کا انجیکشن دے دوں۔ پھر تو سچ بولے۔ جھوٹ مکاری، بزدلی، لوک لاج اور سامنے بیٹھے سُننے والے کی نظر سے بے نیاز ہو کر سچائی باہر نکلے۔ اس کی بنا پر میں ایک خاکہ تیار کروں۔ پتہ ہے کہ اس میں سے کیسا کردار برآمد ہوگا؟ اسے دیکھ کر تو برداشت نہیں کر سکے گا۔

ہاں، تُو نے ٹھیک لکھا ہے۔ سیکٹر سترہ میں میں تیرے نزدیک سے گزری تھی۔ میں تیرے

پاس رکنا نہیں بھی چاہتی۔ میں تجھے زیادہ رنجیدہ دیکھنا نہیں چاہتی ... یہ خط پڑھ کر بھی تو پریشان ہوگا۔ مجھے کمینی عورت کہے گا۔ اور کبھی حملہ کرنا چاہے گا۔ تاک میں رہے گا۔

تُو نے لکھا ہے ... 'یہ کچھ ہونا' سالا کیا ہے؟ یونہی غصہ سا، جبر سا، نفرت سی اور بیتہ نہیں کیا کیا سا؛

میں بتاؤں یہ کیا ہے؟ یہ تیرے ادنیٰ آدمی ہونے کا احساس کمتری ہے۔ کبھی میں سوچتی تھی تُو روحانی طور پر اتنا بلند انسان غریبی کی چکّی میں پس رہا ہے پر بعد میں پتہ چلا کہ تُو روحانی طور پر بھی غریب ہے۔ تیری کہی ایک بات یاد کر کے حیرانی ہوتی ہے 'بڑھیا فن کار بننے سے پہلے بڑھیا انسان ہونا ضروری ہے'... وہ بڑھیا انسان کہاں ہے؟

وہ شخص جس کو تُو نے میر چندانی کا نام دیا ہے، جسے تو نے قابلِ نفرت بنا کے رکھ دیا ہے، وہ تجھ سے بہتر فن کار نہ سہی، ڈرامہ دائرکٹر کی بات بھی جانے دے، وہ ہم دونوں سے کہیں بڑھیا انسان ہے۔ دوسروں کے جذبات کی قدر کرنے والا۔

'کہانی میں تُو نے کانچ ٹوٹنے' کی بات بہت خوبصورت بنائی ہے۔ دُکھ کی گہرائی بتانے کا یہ شاندار طریقہ ہے۔ پڑھ کر بڑا مزہ آیا۔ یہ فن تو جانتا ہے۔ کسی ایک جذبے کو پھیلا کر ساری کہانی پر پھیلا دینا، اور پڑھنے والے کو اس میں پھنسا لینا، عام قاری تو تیرے ہنر کی ان چالاکیوں سے پاگل ہو جاتے ہیں۔ مگر مجھے معلوم ہے، وہ احساس تیرا ایک دو پل کا ہی ہوتا ہے یا گھڑی دو گھڑی کا۔ پھر اس سے نجات پانے کے تو کئی طریقے جانتا ہے...

اس کہانی میں تُو نے خود کو جو سارا دن دُکھ میں لپیٹا ہے ... مجھے معلوم ہے، تو ہم دونوں کو اکٹھے جاتے ہوئے دیکھ کر دُکھی ہوا ہوگا۔ تو جب دفتر گیا تو باقی دن کی چھٹی اور ایڈوانس لے کر بار میں چلا گیا ہوگا یا اپنی برساتی میں بیٹھ کر شراب پیتا رہا ہوگا۔ پھر سیکٹر سترہ کی مارکیٹ میں جا کر ادھر اُدھر کھڑے دوستوں کو مخاطب ہو کر میرا نام لیے بغیر میرے خلاف بکتا رہا ہوگا۔ اس طرح ایک ہفتہ کی خاموشی کا انتقام لے کر برساتی کی چھت پر جا کر لیٹ گیا ہوگا ... تیرے جیسے بھگوڑے اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔ وہ تو یہی چاہتے ہیں کہ خود کو اذیتیں دے کر اپنے اندر دُکھ اکٹھا کر کے مزہ کیسے لیا جا سکتا ہے ... اور اس کے ساتھ دوسروں کو کیسے ہلکان کیا جاتا ہے ... تو

نے یہ بات کبھی کسی کہانی میں لکھی ہے؟

تُو نے لکھا ہے۔ 'جب میری ایسی حالت ہوتی ہے' میں وہ نہیں ہوتا جس کو میرے دفتر والے' دوست، رشتہ دار، میری بیوی، میرے بچّے ایک اور ہاؤس کے دوسرے واقف لوگ جانتے ہیں'... یہ ٹھیک ہے۔ مگر تُو نے یہ سچائی نہیں لکھی کہ اس وقت تو وحشی ہو جاتا ہے اور کسی سے بھی بدلہ لینے کے لیے اتاولا ہو جاتا ہے... تجھے یاد ہوگا۔ دو ڈھائی مہینے پہلے جب تو شراب میں مدہوش سیکٹر سولہ کی مارکیٹ کے چوک میں ملا تھا۔ تُو نے مجھے گالیاں دی تھیں۔ کچھ لوگ تجھے دیکھ کر ہنسے تھے اور کچھ مجھے دیکھ کر۔ پھر تو فٹ پاتھ پر لیٹ گیا تھا۔ تاکہ تجھے تھری وہیلر پر لدوا کر تیری برساتی میں چھوڑ آؤں۔ اس طرح خود کو رول کر اور دوسروں کو رُلا کر ہمدردی جیتنے کی بات۔ تُو نے اس کہانی میں کیوں نہیں لکھی؟ تیری اس بے ہودہ حرکت سے مجھے کتنی تکلیف ہوئی تھی، میں لوگوں کی نظروں میں کتنی ذلیل ہوئی تھی، تجھے احساس ہی نہیں۔ تُو تو صرف یہ جانتا ہے کہ تجھے کتنا دکھ پہنچا۔

دراصل یہ دکھ کسی کے نہیں، تیرے پیدا کیے ہوئے ہیں۔ یہ تیری ذہنی بیماری ہے۔ تو اپنے تصوّر میں دکھ کی صورت حال پیدا کر لیتا ہے۔ پھر اس دکھ کو محسوس کرتا رہتا ہے۔ دُکھ سُکھ ہمارے اندر بنتی مٹتی کمپوزیشن کا نام ہے۔ جس کی کیفیتیں بدلتی رہتی ہیں۔ مگر تو نے اپنے اندر کی کمپوزیشن اتنی بگاڑ لی ہے کہ سکھ پیدا ہی نہیں ہوتا... مجھے تو لگتا ہے کہ کہانی لکھتا ہوا بھی تو خود کو اپنے کردار کی وساطت سے ہمدردی کا حقدار بنانا چاہتا ہے۔ خود پر ترس کھانے کی یہ بیماری یا بیمار رجحان تیری دوسری کہانیوں میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ جن میں کبھی تو تپ دق میں مبتلا ہے اور کہیں کینسر میں۔ اس کہانی 'شولڈر بیگ' میں تیرا خود کو دکھ دے دے کر مارنا اسی بیماری کی علامت ہے۔

میں حیران ہوں کہ اگر کوئی چیز دوستی کے نام پر تجھے دے دی تو وہ تجھ پر بوجھ ڈالنا کیسے ہو گیا؟... اور کسی کو خریدنے والی بات تو بے حد گھٹیا ہے تو اس حد تک گر جائے گا، میں نے کبھی تصوّر بھی نہیں کیا تھا۔

اس کے علاوہ یہ کیا فضول سی بات بنائی تو نے، سگریٹ والی؟... میں نے کب تیری

برساتی میں میک اَپ کر کے تیرے اُوپر جھک کر، تیرا سگریٹ والا ہاتھ پکڑ کر اپنے منہ سے لگا لیا تھا؟... سچ بات تو صرف اتنی تھی کہ میں کرسی پر بیٹھی تھی اور ایش ٹرے میں پڑے تیرے سگریٹ کا ایک کش لے لیا تھا، جو مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔

تیری 'خریدنے' والی بات سے مجھے یاد آیا۔ کبھی مجھے لگتا تھا، تو خود بھی تسلیم کرتا ہے کہ غریبی تیری ہڈّیوں تک میں دھنسی پڑی ہے۔ تیری جیب خواہ بھری ہوئی ہو، پھر نوٹ نکالتے وقت تو فکر مند ہو جاتا ہے۔ میر چندانی تجھ سے بالکل اُلٹے مزاج کا ہے۔ اسے دوستوں کے لیے روپے خرچ کر کے مزہ آتا ہے... میں نے تو پیسے کے لین دین کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں۔

تو نے اپنی کہانی میں دو بار رات کے 'قرض' کا ذکر کیا ہے۔ وہ قرض کون سا ہے؟... یہ کہیں وہ تو نہیں، جس کا ذکر تُو نے ایک ناٹک کے ڈائیلاگ کے حوالے سے لکھا تھا۔ کیا نام تھا ناٹک کا؟ ہاں 'ناخن کا قرض' اور پھر باتیں کرتے ہوئے جذباتی ہونے کے بعد وہ قرض تو نے میرے اوپر ڈال دیا تھا۔ اور میں نے پیار میں دب کر منہ سے کچھ بولے بغیر مان لیا تھا۔ یا یوں کہیئے مجھ سے مان ہو گیا تھا۔ مگر کہانی میں آئی یہ بات ہمیں جاننے والوں کے دلوں میں غلط فہمیاں پیدا نہیں کرے گی؟ تو خود سوچ کر دیکھ... مگر تو کیا سوچے گا۔ تو مرد ہے نا۔ وہ تو یہ بات چاہتے ہی ہیں۔ اور پھر اسے اپنی مردانگی سمجھتے ہیں۔

پھر بھی میں ایک بات واضح کر دوں۔ اگر قرض لوٹانے کا مطلب دوستی نبھانا ہے تو یہ کہنے میں مجھے کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ جب میں نے تجھے دوست کہا تھا تو دوستی نبھانا بھی جانتی ہوں۔ اور 'رات کا قرض' لوٹانا بھی... مگر تیرے جیسے تنگ دل لوگوں سے کیسے نبھے؟

تیری اس کہانی میں مجھے ایک بات اور اچھی لگی ہے۔ تیرے تصوّر میں پیدا ہوا ایک سوال ۔۔ 'پہلے نابھے والی سے تو پوچھ لے؟'... یہ بات متصورہ سہی، پر تیری زندگی کی سچائی ضرور ہے۔ تو اپنی بیوی اور بچّوں کے تئیں کتنی ذمہ داری کا احساس رکھتے ہو۔ یہ تیرے چھوٹے شہر کے ہونے کی وجہ سے تیری خوبی ہے۔ میں وفاداری یا بے وفائی کے چکّر میں نہیں پڑتی، یہ تیری انسان دوستی کا مثبت پہلو ہے... میرا خیال ہے کہ کہانی اس بات پر ختم کر دینی چاہیے تھی۔

تو اپنے کنبے کے بارے میں ایماندار ہے، پر میں نہیں۔ کئی بار مجھے اسی بات سے اُلجھن سی ہوتی ہے۔ مگر جلدی ہی میرے اندر یہ دلیل پیدا ہو جاتی ہے کہ میرا وجود صرف اپنے شوہر اور بچّوں کے لیے ہی نہیں۔ یہ زندگی اس گھر میں عام لوگوں کی طرح گزار دینے کے لیے نہیں ہے۔ اس میں کوئی عجیب و غریب قوت ہے، جو مجھے اُڑائے پھرتی ہے۔ یہ بات سوچتے ہوئے میرا دل میرے کنبے کے پیار سے بالکل کورا ہو جاتا ہے اور کسی اور کے پیار سے بھر جانے کو تڑپتا رہتا ہے۔

میں نے زندگی میں بہت کم جھوٹ بولا ہے۔ اس میں سے سب سے زیادہ اپنے خاوند کے آگے سب سے کم تر سے آگے بولا ہے... میں اور بھی بہت سی سچّی باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ مگر وہ اس خط میں نہیں ہو سکتیں۔

تو سمجھتا ہے 'اک تو ہی دکھی ہے؟ تو ہی سب سے زیادہ دردمند ہے؟... اصل میں بات اس سے اُلٹ ہے۔ تُو اتنا دکھی نہیں ہوتا جتنا تو ظاہر کرتا ہے، یا کہانی میں کہا ہے اور میں ظاہر کرنا نہیں چاہتی۔ جس سے میری ذہنی کیفیت عجیب سی ہو گئی ہے۔ جیسے رونا میرے اندر جم کر سوکھ گیا ہے۔ ایک مہینہ سے میں چاہ رہی ہوں کہ کہیں اکیلی بیٹھ کر جی بھر کر روؤں۔ مگر مجھے اس کام کے لیے نہ ہی فرصت ملتی ہے اور نہ ہی کوئی جگہ۔

کئی بار کوئی فلم دیکھتے ہوئے کتاب پڑھتے ہوئے میرا دل رونا چاہتا ہے۔ آنسو نکل بھی پڑتے ہیں، مگر میں انھیں لوٹانے لگتی ہوں۔ مجھے ساتھ بیٹھے ہوئے لوگوں کی نظروں سے ڈر لگنے لگتا ہے... وہ منظر کسی دُکھ کا نہیں ہوتا، ملاپ کا بھی نہیں ہوتا۔ رونے کا کوئی اور سبب بھی نہیں ہوتا۔ بس یوں ہی جی کر آتا ہے کہ دل میں پڑی اس گانٹھ کو پگھلا کر باہر بہا دوں۔ کبھی کہیں اکیلی بیٹھنے کا بھی موقع ملتا ہے، مگر تب چاہنے پر بھی رونا نہیں آتا۔ بتا، یہ کون سی ذہنی کیفیت ہے؟ یہ تیرے اندر گھسے کانچ سے کم ہے؟

میری دی ہوئی چیزوں کو جلانا مجھے بہت دلچسپ لگا ہے۔ کہانی پڑھنے کے بعد یہ واقعہ میرے تصوّر میں بار بار دوہرایا جاتا رہا مجھے جو فلم دکھائی دیتی ہے، وہ تیری لکھی سے کہیں زیادہ واضح اور سمجھ میں آنے والی ہے۔ تُو نے تو ایک پیرا لکھ کر بات ختم کر دی۔ مگر مجھے اس شخص کا چہرہ بھی دکھائی دیتا رہا جو یہ سب کچھ نہ چاہتا ہوا بھی کر رہا ہے... آگ لگانے سے پہلے،

آگ لگاتے ہوئے اور آگ لگانے کے بعد سلگتی آگ کو دیکھتے ہوئے، چیزوں کے مڑنے تڑنے کو محسوس کرتے ہوئے اور پھر دھوئیں کی بو اُمس اور پھر اس کمرے سے باہر نکل رہے اس کردار کے چہرے کو میں نے دیکھ لیا ہے۔ جس کے بارے میں کچھ بتاتا ہوا تو تذبذب میں رہا ہے... یہ بات میں میر چندانی کو بھی بتاؤں گی۔ اور پھر کبھی جب تو اپنے آپ میں آئے گا' ہم تیرے پاس آئیں گے۔ تیری اس احمقانہ حرکت کا ناٹک کھیلیں گے

مجھے امید ہے' یہ خط پڑھ کر تو ایمانداری سے سمجھنے کی کوشش کرے گا... ایک بات میں واضح کر دوں، جسے تو عشق سمجھتا ہے' وہ مجھے نہ تیرے ساتھ تھا اور نہ میر چندانی کے ساتھ ہے۔ یہ کوئی سودے بازی بھی نہیں، بس دوستی کا ایک رشتہ ہے۔ جس میں لینے دینے کی کوئی بات نہیں۔ اگر کوئی بات ہے تو وہ محبت کے جذبات ہیں۔ تو اپنی تمام برائیوں سمیت اچھا دوست ہے۔ میرے دل میں اب بھی تیرے لیے پیار ہے۔

لے' ایک آخری بات سُن۔ تو یوں ہی نہ روٹھ کر خود کو ہلکان کر۔ میں ایک سیمینار کے سلسلے میں دہلی جا رہی ہوں۔ سنیچر وار کی شام کو لوٹ آؤں گی۔ تب تک میر چندانی بھی آگیا ہوگا۔ ایتوار کی صبح کو ہم تیری برساتی میں آئیں گے۔ پھر لڑ لینا ہمارے ساتھ۔ نکال لینا دل کی بھڑاس۔ گالیاں دے کر بوجھ ہلکا کر لینا۔۔ پھر ہم تجھے لے کر جائیں گے ... جہاں ہماری مرضی ... اس روز تو ہمارا ہوگا، سارے کا سارا۔

تیری دشمن

'وندنا'

ٹیلی فون

یہ کیا بیماری ہے؟ ڈاکٹر اسے کیا نام دیتے ہیں؟... میرا بیٹا ڈاکٹر ستیش کپور اور بہو ڈاکٹر سویتا کپور بھی اس کا کوئی علاج نہیں کر سکے۔ آخر کار وہ یہی کہہ کر ہینڈ کلر دیئے جا رہے ہیں کہ مینوپاز کی اس حالت میں یہ کچھ ہوتا ہی ہے۔ دونوں ڈاکٹر اور ڈاکٹرنی آپس میں باتیں کرتے ہوئے میڈیکل ٹرمیں بولتے ہوئے میری بیماری کی جانچ پڑتال کرتے ہیں۔ مگر مجھے معلوم ہے۔ یہ بیماری کچھ اور ہے۔ میں سمجھتی ہوں، پر ان کو سمجھا نہیں سکتی۔

کوشلیا کچن میں کچھ کھٹکھٹائی تو جا رہی ہے، مگر اتنا نہیں کہ میرا حال ہی پوچھ لے۔ ایک پیالہ کافی کا بنا دے۔ اس کا خاوند خوشیا کوٹھی کی صفائی یا باغیچے کا کام جو کرتا ہے سو کرتا ہے، زیادہ کام وہ میری سی آئی ڈی کا کرتا ہے۔ یہ کام اسے ستیش کا سونپا ہوا ہے۔

یہ باب ہیئر، پینٹ بشرٹ پہننے والی، ہسپتال میں مردوں کے نس بند آپریشن فخر سے کرنے والی یہ بی بی ڈاکٹرنی میں نے ستیش کو کہتی ہوئی سنی تھی: ''کنواری کنیا کی رکشا اس کا پتا کرتا ہے، بیاہی جانے پر پتی۔ اور پتی کے نہ رہنے پر یہ دھرم اس کا پُتر نبھاتا ہے''...

دھرم... دھرم... لعنت... لعن... صدیوں سے رکی ہوئی سوچ... بکواس... بک....

لوگ کہتے ہیں کہ جو سلوک تم اپنے بزرگوں سے کرتے ہو، وہی تمھارے بچّے تمھارے ساتھ کرتے ہیں... مگر بیٹی اپنے باپ سے کون سا بُرا سلوک کرتی ہے، جس کے بدلے میں اس کا بیٹا اس کے ساتھ یہ سلوک کرتا ہے؟... کوشلیا، ایک کپ کافی کا... اگر اس کاہل الوجود کو فرصت ملے تو سر میں تیل ڈال دے، ذرا مالش کر دے۔ درد کچھ تو کم ہو۔ وہ ذرا ٹانگوں کو ہی تھپکیاں مار دے۔ نہیں تو اپنا تناؤ ڈھیلا کریں۔

"فون کس کا تھا؟" میں کافی کی پیالی رکھ کر کوشلیا کو پوچھتی ہوں۔

"کسی مریض کا تھا۔"

"خود شیے نے سنا تھا؟"

"ہاں جی" کہہ کر وہ سر جھکا کر چلی گئی ہے۔ مجھے بھی معلوم ہے اور اسے بھی کہ فون کسی مریض کا نہیں تھا۔ یہ میری کرائی جا رہی سی آئی ڈی کا ایک حصّہ ہے۔ اس وقت فون اکثر پروفیسر ٹھاپر کا ہی آتا ہے۔ اور بتایا مجھے یہ جاتا ہے کہ کسی مریض کا تھا۔

ضروری نہیں کہ ٹھاپر میرے پاس آنا چاہتا ہو یا مجھے اپنے پاس بلانا چاہتا ہو .... اس نے یونہی کوئی بات کرنا ہوتی ہے۔ حال چال پوچھنا ہوتا ہے۔ اکیلی جان ہے۔ کوئی دکھ تکلیف بھی ہو جاتی ہے ... پھر اتنے بڑے شہر میں کتنے فنکشن ہوتے ہیں۔ راگ رنگ کے سمیلن ہوتے ہیں۔ ناٹک کھیلے جاتے ہیں۔ نمائشیں لگتی ہیں ... مگر میں اس کوٹھی میں قید ہوں۔ کوٹھی کا باہر کی دنیا سے ایک رابطہ؛ ایک ہی راستہ ہے، فون۔ وہ بھی بند کر دیا جاتا ہے۔

مجھے باہر کی دنیا سے الگ کرنے کا کام ڈاکٹر نے اتنا نہیں کیا، جتنا میں نے اپنی ضد سے کیا ہوا ہے۔ میں ان کے سر چڑھ کر قید ہوں۔ پہلے میں ضد کر کے باہر نکلا کرتی تھی۔

اگر میں اس قید کی پابندیاں توڑ دوں۔ ٹھاپر کے ساتھ گھوموں پھروں یعنی اپنی مرضی سے زندگی گزاروں تو ڈاکٹر بے موت مرتا ہے۔ میرے گھر واپس آتے ہی ڈاکٹر اور ڈاکٹرنی میرے سامنے ہو جاتے ہیں۔ ان کی آنکھیں پھٹتی ہیں، نتھنے پھڑکتے ہیں ... منہ کھولتے ہیں وہ: لوگ کیا کیا باتیں کرتے ہیں۔ ہم شرم سے مرے جاتے ہیں۔

میں ان کی بات سننے کے لیے چند سیکنڈ کے لیے رکتی ہوں۔ پھر اپنے کمرے میں جا کر اپنا مردہ اپنے بیڈ پر گرا لیتی ہوں۔

مگر میں یہ منظر دوہرانا نہیں چاہتی ... کیونکہ یہ بات سننا بہت مشکل ہے۔ کہتے وقت بھی شاید اتنا مرنا نہ پڑتا ہو ... جس پر گزرتی ہے؟ ... کوئی سوچ کر دیکھے ... ماں کوٹھی میں داخل ہوتی ہے۔ اپنی کوکھ سے جنما بیٹا اور اپنے ہاتھوں بیاہ کر لائی بہو سامنے کھڑے ہیں۔ وہ مہذب سے الفاظ استعمال کر کے ماں پر آوارہ اور بدچلن ہونے کا الزام لگاتے ہیں۔ اس وقت خواہ

کوئی نوکر سامنے نہیں ہوتا مگر ان تک آواز تو جاتی ہے۔

بہت پہلے کی بات ہے۔ ڈاکٹر چھوٹا سا تھا۔ اس کے ڈیڈی کافی رات گئے دوکان سے لوٹتے۔ کھانا کھاتے کھلاتے دس بج جاتے۔ یہ اچانک جاگ اٹھتا۔ کپور صاحب دکھ اور غصّے سے میری طرف دیکھتے۔ آہستہ سے پوچھتے: "یہ سو نہیں سکتا؟"

"سوئے گا، جب نیند آئے گی۔" میں ان کی پریشانی سے ذرا لطف لیتی ہوئی کہتی۔

"کبھی کبھی میرا دل کرتا ہے۔" وہ مجھے دل کی بات بتاتے: "اُسے افیون کھلا کر سُلا دوں۔ اور پھر ہم دونوں ہوں، اکیلے اس کمرے میں"۔ اس وقت وہ اپنے ننھّے سے بیٹے سے آزادی چاہتے تھے اور اب میں اس جوان اور باشعور بیٹے سے۔

میں ان دنوں کپور صاحب کی بات سمجھتی تھی، مگر اس نفسیاتی گہرائی سے محسوس نہیں کر سکتی تھی، جس طرح اب کرتی ہوں... مجھے کپور صاحب کے انتقال کے بعد ہی پتہ چلا تھا کہ بشر اپنے بچّوں کے ساتھ کس شدّت سے جُڑتا ہے اور کتنی شدّت سے ان سے الگ ہونا چاہتا ہے... اور عورت کتنی آزادی میں سانس لے سکتی ہے... جب سوچتی ہوں تو دل میں جھنجلاہٹ سی پیدا ہوتی ہے۔ دل چاہتا ہے کہ شہر کی تمام بیواؤں کو جمع کر کے فیصلہ کراؤں کہ جب بھی کوئی بیوہ مرے، تمام دیگر بیوائیں ہجڑوں کی طرح اس کے مردہ کے سر میں جوتے ماریں اور پکار کر کہیں: "عورت کی جون میں نہ آنا۔ اگر آئی تو خاوند کو ساتھ لے کر جانا۔"

سورج غروب ہو گیا ہے۔ ہوا میں خنکی بڑھ گئی ہے۔ پھر بھی میں باہر نکل کر ٹہلنے لگی ہوں۔ اچھا لگتا ہے ایسے پتلے اندھیرے میں بے پہچان سا چہرہ لیے گھومنا۔ دن کے اُجالے میں پھرنا اب بھلا نہیں لگتا۔

اپنے کمرے سے پام کے درخت تک جاتی ہوں اور لوٹ آتی ہوں۔ اس پام کے بوٹے کی جگہ پہلے یہاں آڑو کا درخت تھا۔ وہ کپور صاحب نے لگوایا تھا۔ مجھے اس کے پھول بہت خوبصورت لگتے تھے۔ جب موسم بہار آتا تھا تو نیم جامنی والے درمیانی حصّے میں سفیدی والے پھولوں کے ڈھیر کو آسمان میں لٹکتے ہوئے دیکھ کر دل کھِل جاتا تھا... ان کے دیہانت کے بعد سینیٹری فٹنگ کی دوکان کا سارا سامان فروخت کر دیا گیا تھا۔ اور ڈاکٹر نے اتنے ارمانوں

سے بنوائے اس مکان میں توڑ پھوڑ کر کے یہ کوٹھی بنوالی تھی۔ اور آڑو کا وہ درخت اکھڑوا کر پام کا یہ بوٹا لگوا دیا گیا۔ پہلے صرف تین کمرے تھے، اب چھ ہیں۔ جن میں ڈاکٹر کا کلینک بھی ہے۔ یہ کاریڈور اور ڈائننگ ہال نئے بنوائے گئے ہیں۔ تینوں بڑے کمروں کے ساتھ اٹیچڈ ٹائیلٹ ہیں۔ میرا کیمرہ بھی پہلے سے کہیں زیادہ ہوادار اور روشن ہے۔ اٹیچڈ ٹائیلٹ میں بڑا آئینہ، گیزر، باتھ ٹب سمیت سُکھ سہولت کا سارا سامان موجود ہے۔

ٹیلی فون کی گھنٹی پھر بجی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ خود جا کر سنوں کہ کون ہے۔ فون کاریڈور اور کلینک کی درمیانی دیوار میں بنی ایک ونڈو میں پڑا ہوا ہے۔

میرے جانے سے پہلے ہی خوشیے نے رسیور اٹھا لیا ہے۔ رسیور رکھنے پر میں اس کے چہرے کی طرف دیکھتی ہوں تو اس کا وہی جواب ملتا ہے: 'کوئی مریض تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو پوچھ رہا تھا۔'

مجھے معلوم ہے، اس کا یہی جواب ہوگا۔ ہر ایک جھوٹ بولتا ہے یہاں... کمینہ... گھٹیا...

میں بڑے کمرے کے اردگرد بنی گول میز کے پاس بچھی کرسی پر بیٹھ جاتی ہوں۔ میرا منہ گیٹ کی طرف ہے اور کان ٹیلی فون کی گھنٹی کی طرف... اس وقت پروفیسر تھا پر اپنے کمرے میں آرام کرسی پر دراز ہوگا... اس کی موٹی موٹی آنکھوں سے آنسو نکل نکل کر اس کی کنپٹیوں کے کھچڑی بالوں میں سے بہہ رہے ہوں گے... یہ کیا ہے؟ کبھی تنہائی کتنا سُکھ دیتی ہے اور کبھی کتنا دُکھ... میں کیا کر سکتی ہوں؟... وہ انسان ہے۔ دُکھ درد جھیلتا ہے۔ میں بھی انسان ہوں... پھر جانور کون ہے؟ ڈاکٹر؟... ڈاکٹرنی؟... کیا گھٹیا پن ہے؟... میرا... تھا پر کا؟... بیٹے کا یا سماج کا؟... سماج... سماج... بکواس... بک...

ہوا کے ساتھ مہندی کے پھولوں کی خوشبو آئی ہے۔ دواؤں کی بُو میں گھس کر اس کا آنا کتنا بھلا لگتا ہے... گیٹ کے پاس مہندی کا بوٹا ہے۔ جو میں نے اپنی ضد کے زور پر کاٹنے سے بچا کر رکھا ہوا ہے۔ یہ بھی کیور صاحب نے ہی لگوایا تھا۔ جب یہاں بیٹھتی ہوں تو بھینی بھینی خوشبو آتی ہے... مگر اس کی خوشبو اور کسی کو محسوس نہیں ہوتی۔ میں جب بھی بیٹے اور بہو سے اس کی بات کرتی ہوں تو وہ اسے میرا وہم سمجھتے ہیں۔ بیٹے نے تو ایک دن یہاں تک پوچھ لیا

تھا۔ ممی، تمھیں اب ساز نہیں بجتے سنائی دیتے؟

میں جھلا اُٹھی تھی۔ اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی... جا کر سوچا تھا کہ اس کی بات بھی کافی ٹھیک لگتی ہے... ایک بار پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ مجھے ساز بجتے ہوئے اور ماہیا گانے کی آوازیں سنائی دیتی رہتی تھیں۔ وہ میرا وہم ہی تھا۔

یہ میرا وہی بیٹا ہے؟ جس کے ذرا سا بیمار پڑنے پر میری جان پر بن آتی تھی۔ جس کی ایک بار آنکھوں کی تکلیف مجھ سے برداشت نہ ہوئی تھی۔ اور میں نے سچے دل سے پرارتھنا کی تھی کہ پرماتما تو ان کے بدلے میری آنکھوں کی روشنی لے لے... یہ جب میڈیکل کالج میں پڑھنے گیا تھا تو اس کی جدائی میں مجھے بخار آجاتا تھا... مجھے اب بھی یاد ہے اس کا وہ چہرہ جب اسے ہوسٹل میں داخل کرا کے بھیجا گیا۔ ہلکے کالے روئیں والا اس کا چہرہ مجھے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے بیٹی سسرال کو جانے لگی ہو۔ گیٹ سے نکلنے پر تو یہ یوں چھاتی میں چہرہ چھپا کر رو ہی پڑا تھا... کہاں گیا اب وہ بیٹا؟...

اب سوچتی ہوں، یہی میرا بیٹا ہے؟ میں نے اسے اس کے باپ کے روکنے کے باوجود کئی آزادیاں لے کر دی تھیں۔ سر کے بال عجیب ڈھنگ سے کٹوانے اور طرح طرح کے ڈیزائنوں والی پتلونیں سلوانے کی چھوٹ دی تھی... ڈاکٹرنی نے جب بال کٹوائے تھے تو میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ اب یہ سفید کوٹ پہن کر مجھے اس زمانے کی عورت سمجھتے ہیں جس کو جوئے میں ہارا جا سکتا ہے۔ جس کو کنڈم کر کے اسٹور میں رکھوا دیا جانا چاہیے۔

کیا میں کبھی سوچ سکتی تھی کہ میرا بیٹا ہی مجھ پر شک کرے گا؟ کتنی کمینگی ہے۔ گناہ جیسی میں تھاپر کو ملتی ہوں، ملنا چاہتی ہوں۔ اس کے ساتھ شام گزارتی تھی۔ کافی ہاؤس میں بیٹھتی تھی۔ مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں... سب بکواس ہے۔

کبھی کبھی دل چاہتا ہے۔ فون کر کے تھاپر کو بلاؤں۔ اپنے کمرے میں بٹھاؤں اور جب ڈاکٹر اور ڈاکٹرنی گیٹ میں کھڑے ہوں، میں تھاپر کے ساتھ چلتی ہوئی گیٹ سے باہر نکل جاؤں۔ پھر جب دل کرے لوٹوں۔

لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا... جو ہوا تھا، اس کا کسی کو کیا پتہ۔ اس کا تصور بھی نہیں

کیا جا سکتا۔ جو ہوا تھا، وہ میں نے نہیں کیا تھا۔ مجھ سے ہو گیا تھا۔ کسی انجانی قوت نے مجھ سے کروا دیا تھا۔

بہت پہلے کی بات ہے۔ ڈاکٹر بہت چھوٹا تھا۔ ابھی اسکول نہیں جانے لگا تھا.... ہماری دوکان میں کام کرنے والا ایک سیلزمین میری زندگی میں اچانک داخل ہو کر اچانک ہی نکل گیا تھا... اس داخل خارج میں نہ اس کا ہاتھ تھا اور نہ ہی میرا۔

شام لال کسی قصبے سے آیا غریب آدمی تھا۔ وہ شادی شدہ تھا۔ اس کے بچّے بھی تھے۔ سانولے سے رنگ کے اس نوجوان کی شکل و صورت کوئی خاص نہیں تھی۔ وہ ہر روز دوپہر کو کپور صاحب کے لیے ٹفن کیریئر لینے آتا تھا۔ پتا جوان دِلوں ہماری نوکرانی تھی کے کھانا ڈبے میں بند کرنے تک، شام لال ڈرائنگ روم میں بیٹھا رہتا تھا۔ میں گھر میں تنہا اکتائی بیٹھی ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ باتیں کر لیا کرتی تھی۔

اسے لگاتار دیکھتے ہوئے مجھے لگتا، 'اس میں کوئی بات ہے' جو مجھے اپنی طرف کھینچتی ہے۔ مگر وہ ہے کیا؟ میں سمجھ نہ پاتی تھی... میں نے سوامی وویکانند کے بارے میں پڑھا تھا کہ یورپ میں عورتیں اس سنیاسی کو دیکھ کر پاگل ہو جاتی تھیں۔ اُٹھ کر اس کے پیچھے چل دیتی تھیں ایک بار ایک عورت نے رات کو ان کے پاس آ کر کہا تھا: 'سوامی جی۔ میں چاہتی ہوں کہ میری کوکھ سے آپ جیسا بیٹا جنم لے' اور سوامی نے بڑی عقیدت اور پیار سے کہا تھا: 'ماتا تو مجھے ہی اپنا بیٹا سمجھ لے؟... فضول روایتی سا جواب تھا...

شام لال کو دیکھ کر مجھے سوامی وویکانند والی بات یاد آ جاتی تھی۔ سوامی بہت خوبصورت تھا مگر شام لال نہیں تھا.... ان دِنوں مجھے اکثر یہ خواب دکھائی دیتا تھا۔ جنگل میں ایک ہرن دکھائی دیتا، ہرن نہیں جیسے ہرن کا بچّہ ہو۔ مجھے اس کا جسم کم دکھائی دیتا، اس کے جسم سے نکلتی چمک زیادہ دکھائی دیتی۔ میں اسے پکڑنے کے لیے اس کے پیچھے بھاگتی۔ جوں جوں میں اس کے نزدیک ہوتی جاتی، اس کا قد چھوٹا ہوتا جاتا۔ رفتہ رفتہ وہ زمین پر رینگ کر چلنے والا چار پیروں والا جانور بن جاتا۔ جب وہ میرے ہاتھ میں آتا تو بدشکل سانولا، چوہا یا گرگٹ سا بن جاتا جس کے جسم کو ہاتھ لگاتے ہی لیس دار سا کچھ مادّہ ہتھیلیوں اور انگلیوں سے چپک

جاتا ہے۔ میں اس چپچپے جسم والے جانور کو دور پھینک دیتی ہوں۔ وہ دور جا گرتا ہے تو بھی مجھے غلاظت کا احساس ہوتا ہے۔ اس سے جو گھبراہٹ سی ہوتی ہے وہ سونے نہیں دیتی۔

شام لال میں اس ہرن جیسی کشش تھی، مجھے بے بس کرنے والی اور خوفزدہ کرنے والی... وہ باتیں کرتا تو لگتا، وہ زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہے۔ مگر جب وہ ٹھنڈی سی آواز میں کوئی ذاتی تجربہ بتاتا تو لگتا کہ اس کی بات میں بہت دانائی اور گہرائی ہے۔ اس کے ساتھ باتیں کرکے میرے دل میں اس کے لیے دو تعریفی الفاظ پیدا ہوئے تھے۔ اُورجنل اینڈ پیور (طبع زاد اور خالص) اس کے دل میں اور اس کی بول چال میں کسی قسم کی بناوٹ اور فریب نہیں تھا۔

جب یہ بات میرے دل میں پیدا ہوتی تھی تو میں خود کو بہت سمجھاتی رہتی تھی۔ بے وقوف نہ بن۔ یہ کوئی چھلاوہ ہے... وہ چھلاوہ ہی تھا۔ وہی نہیں، اس سے وابستہ ساری سوچ اور اس سوچ سے پیدا ہونے والا سارا ماحول وہم لگتا تھا۔

ایک روز وہ کھانا لینے آیا۔ پشپا گھر پر نہیں تھی۔ میں کھانا پیک کرکے لائی تو میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ جیسے کوئی انہونی ہونے والی ہو۔ میں نے کھانا میز پر رکھ دیا اور صوفے پر بیٹھ گئی۔ مجھے کرنے کے لیے کوئی بات نہیں سوجھ رہی تھی۔ اگر کوئی بے مطلب سوجھ بھی رہی تھی تو زبان پر نہیں آرہی تھی۔ سوامی وویکانند میرے سامنے صوفے پر بیٹھا تھا... اس کی پیشانی چمک رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر ٹفن کیریئر کو ہاتھ لگایا تو مجھے لگا، میں بے حس ہوگئی ہوں ... پھر پتہ نہیں کس نے میرا ہاتھ اٹھا کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا اور مجھ سے کہلوا دیا: 'رک جا!' میں نے اُٹھ کر اس کا ماتھا چوم لیا جس میں سے شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ اس کی طرف لگاتار دیکھتے ہوئے آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ دیکھنے کی تاب نہ لاسکا تو نظریں جھکا لیں۔ میں نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

پھر جب بھی موقع ملتا، میں ایسے ہی کرتی۔ یہ سراب کتنی مدت مجھے لیے گھومتا رہا۔ میں بے حال ہو جاتی۔ مگر پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر میں بھاگی جارہی تھی۔

ایک روز ٹفن کیریئر میز پر تھا۔ وہ صوفے پر بیٹھا تھا۔ میں اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اچانک اُٹھا۔ بس ایک دم پاگلوں کی طرح مجھے جھنجھلاہٹ ہوئی۔ دل میں نفرت سی پیدا ہوگئی۔ میں

نے اسے اپنے جسم سے توڑ کر پرے پھینک دیا۔ چیچپا نے جانور کو... وہ اُٹھا۔ کچھ بولے بغیر، میری طرف دیکھے بغیر، اس وقت ڈبہ اٹھا کر چلا گیا۔

بعد میں میں پچھتاتی رہی کہ یہ میں نے کیا کیا؟... شام لال اسی روز ملازمت چھوڑ گیا تھا اور پھر شہر بھی۔

اُسے کہتے ہیں، 'گڈ اولڈ ڈیز'۔ جب کوئی بیٹھ کر پرانی باتیں یاد کرے تو وہ بوڑھا ہوتا ہے'... 'شٹ اپ کہتے ہوں گے'... میری یہ پونجی نہیں۔ مجھ میں ابھی کافی جان ہے۔ میں اب بھی ہر قسم کے جذبات محسوس کرتی ہوں۔ یہ بات الگ ہے کہ اب میں پہلے کی طرح بے بس نہیں ہوتی۔ اب بے بسی کسی اور طرح کی ہے۔ جو حالات کے بدلنے پر دوسروں کے رویّوں میں آئی تبدیلیوں پر غصّہ آنے پر محسوس ہوتی ہے۔ بذاتِ خود سوچتے رہنے مگر کچھ کر نہ سکنے کی بے بسی۔

اُس بے بسی کا بھید میں اب تک نہیں سمجھ سکی۔ مجھ سے گہرا بھید شام لال کا تھا۔ اس کی وہ حالت کیوں ہوتی تھی؟... میں اس سے پرے ہٹ کر بیٹھ جاتی۔ وہ غالیچے پر ہی بیٹھا رہتا۔ پھر وہ آلتی پالتی مار لیتا۔ آنکھیں بند کر لیتا۔ کچھ دیر اسی حالت میں رہتا۔ پھر آنکھیں کھولتا۔ مجھے دیکھتا۔ اس کی آنکھیں سُرخ ہوتیں۔ اس کی پلکیں بالکل نہ جھپکتیں۔ لگاتار دیکھے جاتا تو میری نظریں جھک جاتیں۔ وہ دیکھتا دیکھتا رونے لگ پڑتا۔ آنسو بہنے لگتے۔ پھر بآوازِ روتا ہوا وہ پیروں پر گر پڑتا۔ میں مشکل سے اسے اٹھا کر پیار سے چپ کرا کے تسلّی دیتی۔

وہ ایسی حرکتیں کیوں کرتا تھا؟ میں سمجھ نہ پاتی... یہ واقعہ گزرے وقت کا ہے۔ جو سچ مچ گزرا تھا لیکن اس کے چلے جانے کے بعد ایسے لگنے لگا تھا، جیسے کوئی خواب دیکھا ہو۔ یا کوئی واقعہ تصوّر ہی میں گزرا ہو، جسے دن کا خواب کہتے ہیں۔ اب بھی ایسے لگتا ہے کہ وہ سچ نہیں تھا۔

ان دنوں کپور صاحب کی صحت ٹھیک تھی۔ وہ خوش تھے۔ مگر میں کھوئی کھوئی سی رہتی تھی جیسے مجھ پر کسی سائے کا اثر ہو۔ کپور صاحب بہت بھلے تھے۔ بہت پیار کرتے تھے مجھے۔ مجھے بھی وہ بہت پیارے لگتے تھے۔ انھوں نے مجھے آزادیاں دے رکھی تھیں گھومنے پھرنے کی۔ وہ دوکاندار تھے مگر پرانے بنیئے نہیں تھے۔ وہ گورنمنٹ کالج کے گریجویٹ تھے۔ فلمیں دیکھتے

تھے۔ ادب اور موسیقی میں دلچسپی لیتے تھے۔ مگر جب ان موضوعات پر پروفیسر تھاپر بولتا تھا تو وہ منہ تاکتے رہ جاتے تھے... اس بات سے کبھی مجھے شرمندگی گھیر لیتی تھی اور کبھی فخر۔ کبھی مجھے کپور صاحب پر ترس آتا اور کبھی اپنے آپ پر غصہ آتا۔ کبھی تھاپر کے بارے میں ایسا کوئی جذبہ بیدار ہوتا تو بہت ہی غیر واضح سا ہوتا۔

جب اس خواب کا طلسم ٹوٹا تو میں کپور صاحب کے گلے لگ کر بہت روئی تھی۔ وہ بات پوچھتے رہے تھے مگر میں بتا نہیں سکتی تھی۔ وہ یہی سمجھتے تھے کہ اسے دور رہ رہے بیٹے کی یاد ستاتی ہے۔ مگر میں شام لال کے لیے نہیں، کسی اور ہی وجہ سے روئی تھی، جو میری سمجھ میں بھی نہیں آئی تھی۔

ڈاکٹر اور ڈاکٹرنی آگئے ہیں۔ زوں کر کے ان کا اسکوٹر اندر آیا ہے۔ پھرتی سے وہ اترے ہیں۔ اپنے اپنے ریکیٹ لے کر اندر چلے گئے ہیں۔ ہلکی ہلکی سردی ہے تو بھی ڈاکٹر نے نیکر اور بنیان پہن رکھی ہے۔ ڈاکٹرنی نے ٹی شرٹ اور پینٹ پہن رکھی ہے۔ ڈاکٹر کے بال ڈاکٹرنی کے بالوں سے بڑے اور خوبصورت ہیں۔ وہ ویسے بھی اس سے زیادہ خوبرو سجیلا جوان ہے۔ ڈاکٹرنی کی چھاتیاں ہی چھوٹی چھوٹی ہیں۔ یہ کیا بچے جنے گی اور کیا پالے گی... میرے جسم میں اس سے کہیں زیادہ طاقت ہے۔

اندر کھانا لگنے کی آوازیں آنے لگی ہیں۔ آج انھیں جلدی کھانا کھا لینا ہے کل اتوار ہے نا۔ دیر سے جائیں گے... کھانے کے بعد یہ کچھ دیر کے لیے ٹی۔ وی دیکھیں گے۔ پھر تھکاوٹ کا بہانہ کریں گے، جو میرے لیے اٹھ جانے کا اشارہ ہوتا ہے۔ تاکہ وی سی آر پر کوئی بلیو فلم دیکھی جا سکے... اور میرے بارے میں ان کا خیال ہے کہ مجھے کھانا کھانے سے پہلے اور کھانا کھانے کے بعد پرماتما کا نام لینا چاہیے... یہ ایسا کیوں نہیں کہتے کہ مجھے اپنے کمرے سے باہر کسی بھی چیز سے واسطہ نہیں رکھنا چاہیے۔ اور اپنے بستر میں دفن ہو کر موت کا انتظار کرنا چاہیے... دشمن... دشمن... کوکھ سے جنما دشمن...

میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔ میں چاہتی ہوں، پہلے کوشلیا میرے سر کی مالش کر دے۔ پھر ذرا آرام کر کے میں نرم گرم پانی سے بھرے ٹب میں لیٹ کر نہالوں۔ پھر کھانا کھانے کے بعد اس وقت

تک جاسوسی ناول پڑھتی رہوں جب تک نیند آ کے گرا نہیں دیتی۔

مجھے آواز دی گئی ہے۔ وہ میرا انتظار کرنے لگے ہیں۔ یہ ماڈرن کلچر کا تقاضا ہے کہ سارا کنبہ ایک میز پر بیٹھ کر کھانا کھائے۔ دن بھر کے اپنے مسائل کے بارے میں گفتگو کرے۔ ہم جب بھی اکٹھے کھانا کھاتے ہیں، یہ دونوں اپنے ہسپتال، اپنے ساتھی ڈاکٹروں اور مریضوں کی باتیں کرتے ہیں، وہ مجھے بھی اچھی لگتی ہیں... لیکن میری باتیں؟... میں کسے سناؤں، اپنی قید کی بات، اپنی سوچ کی بات، اپنے اندر بڑھ رہے دُکھوں کی بات۔ اور اس تکلیف کی بات جو کسی کو بتا نہیں سکتی، جس کو بتا سکتی ہوں، وہ اس گھر میں آ نہیں سکتا۔ میں اس کے پاس اس کے گھر جا نہیں سکتی۔

میں حیران ہوتی ہوں... اس گھر میں جب بھی یہ نوجوان ڈاکٹر اکٹھے ہوتے ہیں تو تیزی سے ترقی کر رہی میڈیکل سائنس کی باتیں کرتے ہیں۔ وہ دل اور جسم کے دیگر اعضا کے ٹرانسپلانٹ ہونے کی باتیں کر کے بہت خوش ہوتے ہیں۔ وہ ذہنی صحت کے ساتھ بشر کے بدلتے روّیے کے بارے میں سوچتے ہیں۔ وہ زندگی میں سیکس کے رول کی پہیلیاں بوجھتے ہیں۔... وہ آدمی کو بہت دیر تک تروتازہ رکھنے کے طریقوں کے بارے میں بحث کرتے ہیں۔ لیکن وہ میرے بارے میں کیا سوچتے ہیں؟... وہ تو چاہتے ہیں کہ گھر میں جس بھی فرد کے تھوڑے سے سفید بال آ جائیں اسے ایک دم بوڑھا قرار دے کر مار ڈالا جائے۔

ستیش کا ایک دوست ذہنی امراض کا ماہر ہے۔ اس نے بھی ایک دن میرا پورا چیک اپ کیا تھا۔ کتنے ہی سوالوں سے اس نے میرے دل کی وہ گانٹھ کھولنا چاہی تھی جس نے میری ذہنی کیفیت بگاڑ رکھی ہے، خواہ میں ذہنی امراض کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ مگر میں عورت ہوں نا۔ میں نے اس کو بھی ایسا جُل دیا کہ وہ ایک قسموں کے ٹرانکو لائزر دے کر سلا دینے کر گیا... میں اسے اپنی اصلی حالت بتا بھی کیسے سکتی تھی؟

جب وہ حیران ہو کر اپنا قلم پیڈ پر رکھ کر بیٹھ گیا تھا تو ایک بار میرا دل چاہا تھا کہ کہوں کہ تم نے مینوپازل عورتوں کے بدلتے مزاج کے بارے میں جو کچھ پڑھا ہے، وہ بھی میرے پر لاگو نہیں ہو گا، پوری طرح... دراصل وہ بھی یہی سمجھتا تھا کہ جب عورت اپنا بیٹا بیاہ لیتی

ہے تو وہ بدرنگ سی دھوتی کے پلّو سے چابیوں کا گچھّا باندھ کر گھر کے رسد پانی کا انتظام کرنے کے قابل ہی رہ جاتی ہے۔ اس میں کسی کو پیار کرنے، سیر سپاٹے کو جانے، خطرہ مول لے کر کوئی کام کرنے اور اپنی زندگی اپنی مرضی سے جینے کا کوئی حق نہیں رہتا۔

کافی دیر ہو گئی ہے۔ میں اندر جاتی ہوں۔ سب، کھانا کھا رہے ہیں۔ میرا انتظار کیے بغیر ہی۔ میں اس بات پر غصّہ نہیں کرتی۔ میں قصوروار ہوں۔ خود ہی ان لوگوں سے ٹوٹتی جا رہی ہوں۔ ہمارے درمیان کوئی لکیر خود بخود کھنچی چلی جا رہی ہے۔ جو ہماری بدلتی ہوئی سوچ، بدل رہے زمانے اور بدل رہی ذہنی کیفیت پر حاوی ہے۔

میں پرہیزی کھانے کے طور پر کچھ چاول لیتی ہوں۔ کچھ دہی، کچھ سبزی۔ بس۔ گھی والی چیزیں کھانے سے پیٹ اور پہلوؤں پر چربی بڑھنے لگتی ہے۔ فگر بھدّی ہو جاتی ہے خواہ کسی نے دیکھا ہو یا نہیں۔ میں نے خود تو دیکھنا ہے... پروفیسر ٹھاکر کو اب کچھ بھی دکھانے کی ضرورت نہیں۔ وہ تو بے چارہ مجھے مل کر بھی دُکھی ہوتا ہے، نہ ملنے پر تو ہونا ہی ہوتا ہے۔

میں جلدی اپنے کمرے میں آ گئی ہوں۔ آرام کرسی پر بیٹھ کر ٹانگیں دیوان پر رکھ کر سوچتی ہوں... ٹھاکر اور میرے درمیان کیا رشتہ ہے؟ جب وہ کپور صاحب کے دوست کے ناتے ملتا تھا تو لگتا تھا کہ کپور صاحب میرے ہمسر نہیں ہیں۔... پھر جب، ٹھاکر محبت جتانے لگ پڑا تھا تو مجھے جھنجھلاہٹ ہونے لگی تھی۔ میں نے اسے ذہنی طور پر جھٹک دیا تھا۔ وہ ڈر کر پرے ہو گیا تھا... مجھے لگا تھا کہ کپور صاحب سے بہتر اور شخص ہی نہیں اس جہان میں... پھر ہم خود جا کر ٹھاکر کو منا کر لائے تھے اس کے گھر سے... در اصل میں ہی ڈر گئی تھی خود سے... کتنی فضول سوچ تھی، عام عورتوں والی۔

کپور صاحب کے انتقال کے بعد مجھے لگا تھا... اس ٹھاکر کے سوا اور کوئی ہمدرد ہے ہی نہیں میرا۔ وہ میرے دل کی بات جھٹ بوجھ لیتا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ دل میں سونا پن کب پیدا ہوتا ہے اور اس کو کیسے بھرا جا سکتا ہے... پھر اب کیا ہو گیا؟ دل کے ویرانے گہرے کیوں ہو گئے؟ یہ اب بھرے کیوں نہیں جاتے؟... یہ ڈاکٹر کون ہوتا ہے؟... روایت پرست... روایت پرست...

وہ شام لال کون تھا؟ کیا تھا؟ ... کچھ بھی نہیں۔ میری سوچ سے ہی اس کا وجود بنا تھا ... سب کچھ میں ہی تھی ... اس کے چہرے میں سوامی وویکانند والی کشش بھی میری ہی تھی ... مگر یہ بھا پر کیا ہے؟ کسی کی کمزوری کا نام ہے؟ ... یا کسی کی قوت ہے؟ ...

ڈاکٹر کے بیڈ روم سے ہلکی ہلکی آواز آرہی ہے۔ وہ کوئی فلم دیکھ رہے ہیں۔ دی۔ سی۔ آر پر ... میرے جسم پر چیونٹیاں رینگ رہی ہیں۔ لیسدار سا کچھ مادّہ ابھر رہا ہے۔ چپچپاہٹ۔ جیسے برسات میں پسینہ آنے پر ہوتا ہے۔ دل چاہتا ہے ٹب میں نیم گرم پانی بھر کر نہاؤں۔

میں دروازے کی چٹخنی بند کر کے باتھ روم میں آگئی ہوں۔ گیزر آن کر دیا ہے۔ سارے کپڑے اتار کر آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی ہوں ... کتنا بھدّا سا ہے یہ جسم۔ حاملہ عورتوں جیسا پیٹ۔ میں سانس کھینچ کر، پیٹ کو پیچھے ہٹا کر چھاتی پھُلاتی ہوں۔ اور ایڑیوں کے بل ہو کر پھُدک کر دیکھتی ہوں ... جسم میں کتنی لچک ہے۔ اگر ذرا کسرت یا یوگ ابھیاس کر لوں تو یہ کتنا سڈول ہو سکتا ہے۔ اس کے پٹھے کتنے مضبوط ہیں اب بھی ... جسم کے ہر حصّے میں خون کا بہاؤ تیز ہے۔

میں خود کو ٹب میں لٹا کر پانی میں ڈبو لیتی ہوں۔ اچھا لگتا ہے اپنے اعضاء کو اپنے ہاتھوں سے دھیرے دھیرے ملنا ... اگر ملنے والا ہاتھ کوئی اور ہو ... کوشلیا کا ... یا بھا پر کا؟ ... فضول ... فضول ... لعنت ... لعن ... ت ... مگر اس میں بُرا کیا ہے؟ ... کیا بُرا ہے؟ ... اگر کسی عورت کا خاوند نہ رہے تو کیا اسے خواب دیکھنے کا بھی حق نہیں رہتا؟ ... نئی تہذیب یہی کہتی ہے کیا؟

ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز پھر آئی ہے۔ اب کوئی نہیں سُنے گا۔ کوئی بھی نہیں۔ ڈاکٹر نے دروازہ بھی بند کر دیا ہے۔ اگر ٹرٹر کی آواز تنگ کرتی رہی تو اُٹھ کر ریسور اٹھا کر رکھ دے گا ایک طرف ... اور بھا پر بولتا بولتا سو جائے گا۔

بھا پر کو جب بھی موقع ملتا ہے، اپنے خراب ہو رہے پھیپھڑے کی بات کرتا ہے۔ یا اپنی بکھرتی ہوئی ذہنی کیفیتوں کی۔ پھر کچھ دیر خاموش رہتا ہے پھر دبی سی آواز آتی ہے

"چلو کہیں گھوم آئیں!"

میں مردہ سی آواز میں کہتی ہوں 'اچھا' جس کا مطلب نہ 'نا' ہوتا ہے اور نہ 'ہاں'۔
پھر مُردہ سے لفظ 'اچھا' کی آواز کانوں میں گونجتی رہتی ہے۔ خواہ دوسرے الفاظ بولے جا رہے ہوتے ہیں... اور... اور... بس... بس... ہاں... ہا... آہ سی۔
"خاموش کیوں ہو گئے؟"، وہ ٹھٹھک کر پوچھا کرتا ہے۔ مگر میں بولتی نہیں کہ ڈاکٹرنی آ گئی ہے۔ یا خوشیا آ کر کھڑا ہو گیا ہے دروازے کی اوٹ میں۔ چپکے سے ریسور رکھ دیتی ہوں۔
ٹھاپر نے ستیش کی شادی میں باپ کی ذمہ داری نبھائی تھی۔ وہ مجھے بھابھی جی کہتا ہے۔ جو مجھے اچھا لگتا ہے۔ کبھی ستیش کو بھی اچھا لگتا تھا۔ مگر اب اسے تکلیف ہوتی ہے۔ وہ بگڑ جاتا ہے ٹھاپر کو میرے پاس بیٹھا دیکھ کر، میرے ساتھ باتیں کرنے کی آواز سن کر۔ اگر ٹھاپر کے منہ سے شراب کی ہلکی سی بھی بُو آ جائے تب تو آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ ویسے خود شراب پیتا ہے، اپنے دوستوں کو پلاتا ہے۔ جو ڈاکٹرنی کے پاس بیٹھ کر فلموں کے شرابی ڈائیلاگ بولتے ہیں۔ ایکٹنگ کرتے ہیں۔ جو جسم کے ہر حصے کو گوشت، رگوں اور کھال کا بنا عام ساحصہ جان کر چھوتے ہیں اور مذاق کرتے ہیں۔
ڈاکٹر ہمیں اکٹھے بیٹھے دیکھ کر ایسے دیکھتا ہے جیسے اپنے انکل کو باہر نکال کر اپنی ممی کو ذلیل کرے گا۔ ویسے اس کا ایسے دیکھنا بھی ذلیل کرنے سے کم ہے کیا؟
ایک روز ٹھاپر چلا گیا تو ڈاکٹر میرے پاس آ کر کہنے لگا: "مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں۔ میں نفرت کرتا ہوں۔"
"کیا؟... کس کو؟" میں پوچھتی رہی۔ وہ نتھنے پھنکارتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔
ایک بار ہم کھانا کھا رہے تھے۔ ٹھاپر آ گیا۔ میں نے کچھ رسم نبھاتے ہوئے اور کچھ دل کی مجبوری سے آئس کریم والی اپنی پلیٹ اس کی طرف بڑھا دی تھی۔ بس، ڈاکٹر کو پتہ نہیں کیا ہو گیا تھا۔ وہ کھانا درمیان میں چھوڑ کر اٹھ گیا۔ تبھی ڈاکٹرنی بھی ہاتھ میں پکڑا لقمہ چھوڑ کر چلی گئی۔
ڈاکٹر کا رویّہ پہلے اس طرح کا نہیں تھا۔ یہ فرق شادی ہونے کے بعد پیدا ہوا ہے۔

شروع شروع میں میں اس کی پروا نہیں کرتی تھی۔ اس کے سامنے تھاپر کے ساتھ چلی جاتی تھی۔ ہم کسی ریسٹورینٹ میں چائے پی آتے تھے۔ کوئی ناٹک دیکھ لیتے تھے۔

اب گرم پانی اچھا نہیں لگتا۔ ٹب میں سے نکل کر تولیے سے جسم رگڑ کر جلدی کپڑے پہن لیے ہیں۔ اور کرسی پر بیٹھ گئی ہوں۔ مگر ناول پڑھنے کو دل نہیں کرتا۔

ساڑھے دس بجے ہیں۔ پتہ نہیں نیند کب آئے... رات ختم ہونے میں ہی نہیں آتی

جب میں چھوٹی تھی تو سوچا کرتی تھی کہ اگر سفید بالوں والا کوئی شخص مر جائے تو کیا حرج ہے۔ وہ بہت کھا، پہن اور جی چکا ہے... اب پتہ چلتا ہے کہ اس عمر میں بھی بستر کتنا مکمل ہونا ہے۔ جی بھر کر جینے کی اس کی تمنا جوان سے بھی زیادہ ہوتی ہے... اسے بھی شام لال کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی تھاپر کی ضرورت پڑتی ہے۔

میں ڈاکٹر بہو کے لیے ساس نہیں بننا چاہتی۔ ڈاکٹر کے لیے رکاوٹیں پیدا کرنے والی اور نصیحتیں کرنے والی ماں نہیں بننا چاہتی... کوشلیا اور خوشیا کے لیے مالکن نہیں بننا چاہتی... پھر یہ سارے میرے خلاف کیوں کھڑے ہیں؟ دشمن کیوں ہو گئے ہیں، میری جان کے؟

باپو

گاؤں میں سب سے خوبصورت اور سجا ہوا یہ ہمارا گھر کامریڈ دیبی عرف پنگا کا کہلاتا ہے۔ وہ میرا باپو تھا۔ آج اسے سورگباس ہوئے کو چھبیس برس ہو گئے ہیں۔

اپنے پختہ صحن میں املتاس کے پتّوں اور پھولوں کی چھدری سی چھاؤں میں میں لیٹا ہوا ہوں۔ پیلے جھمکوں جیسے پھولوں نے پتّے بھی ڈھانپ رکھے ہیں... بیساکھ میں اس کو پھول آتے ہیں۔ کھیتوں میں گیہوں پکتا ہے۔ مجھے باپو یاد آتا ہے... ان دنوں میں وہ اپنے دوست چاچا دینا ناتھ کے چوبارہ میں ہم سے روٹھا ہوا ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا تھا... اس کی موت میرے سبب ہوئی تھی یا میری بیوی سیتو کی وجہ سے؟... شاید دونوں کا قصور تھا۔ کچھ باپو کا بھی... بس قدرت نے ایسے حالات پیدا کر دیے تھے کہ وہ سب کچھ ہو گیا تھا، جو ہم تینوں نہیں تھے چاہتے۔

پہلے میرے اندر یہ دُکھ جم سا گیا تھا کہ دیکھو جاٹ کا پوت اتنی غریبی سہنے کے بعد جب کھانے پینے کی حیثیت والا ہوا تو اپنے راج بھاگ کا سکھ نہ بھوگ سکا... پھر جب کئی برسوں کے بعد سیتو نے مجھے سچّی بات بتائی تھی تو میرے اندر وہی دُکھ پیٹ میں اپنی نسل بڑھانے والا لمبا کیڑا بن گیا تھا۔ جسے میری گھر والی، بیٹیاں، بہو اور پوتوں کا پیار اور بنکوں کی کاپیاں بھی نہیں نکال سکیں۔

بہو دو بار آکر پیائے کے بارے میں پوچھ گئی ہے۔ پوتا کئی بار آکر دھات کر گیا ہے... مجھے کوئی تکلیف نہیں۔ مگر دل جیسے گھلنے لگ جاتا ہے ان دنوں، پھر ڈوبتا سا محسوس ہوتا ہے۔

جب باپو کا دیہانت ہوا تھا تو مجھے شرمندگی نے دبا لیا تھا۔ اس نے پرائے گھر کی چارپائی پر پران چھوڑے تھے۔ وہ گاؤں میں تو کیا، اِرد گرد کے دیہات میں بھی بدنام ہو گیا تھا۔ بدنامی سارے کنبے کی ہوئی تھی... سسر نے بہو پر ہاتھ ڈال دیا تھا... پھر بھی ہم نے پاٹھ رکھوا لیا تھا۔ اس کی آتما کی شانتی کے لیے نہیں، وہ پرماتما کو مانتا ہی نہیں تھا۔ ویسے ہی لوک لاج بچانے کے لیے دکھاوا سا کیا تھا۔

املتاس کا یہ درخت باپو نے لگایا تھا۔ اس وقت لوگوں نے مذاق اُڑایا تھا۔ لوگوں نے تو مذاق اس وقت بھی اُڑایا تھا جب باپو نے کھیتوں میں پاپلر، سفیدے اور ڈھاک کے درخت لگوائے تھے اور ٹیوب ویل والے کوٹھے کو پھولوں والے بوٹوں سے گھیر لیا تھا... تب مجھے بھی لگا تھا کہ باپو کی کھوپڑی سچ مچ اُلٹی ہے۔ وہ کھیتوں میں سے کنوئیں کو جانے والا راستہ میں کھڑا ہو کر فصلوں کے ساتھ ساتھ کھلے پھولوں والے بوٹوں اور درختوں کی قطاروں کی طرف دیکھتا ہوا مجھے بتایا کرتا تھا کہ آدمی کو روٹی مل جائے پھر اسے صرف روٹی کے لیے ہی نہیں جینا چاہیے... میں اس کی بات سمجھ نہیں پاتا تھا۔ چاندنی راتوں میں وہ ٹیوب ویل کے کوٹھے پر بیٹھ کر شراب پیتا تھا۔ میں جو کھانا لے کر جاتا تھا۔ وہ بڑا ٹھنڈا ہو جاتا تھا۔ اسے میری آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔

اب میں اتنا بڈھا نہیں ہوں۔ مگر کام نہیں کرتا۔ کام سال بھر کے لیے رکھے نوکر اور بھیے کرتے ہیں۔ بیٹا جے پال نگرانی کرتا ہے۔ میں تو بس یونہی چکّر لگاتا رہتا ہوں۔ کبھی کھیتوں کے، کبھی دفتروں کے اور کبھی بنکوں اور شہر کے بازاروں کے۔

یہ گھر کچا تھا جب دادی زندہ تھی، بے بے تھی۔ باپو بلدیو سنگھ دیسی تھی تایا حضورا ایک ہل کی کھیتی کرتا تھا۔ کچے گھر کے اس آنگن میں بارش ہونے پر گھٹنے گھٹنے تک کیچڑ چڑھ جاتا تھا۔ گڑھے پڑ جاتے تھے۔ تین مویشیوں کو بھی بیٹھنا مشکل ہو جاتا تھا۔ شام کو روٹی کے ساتھ دال نہیں پکتی تھی۔ صبح کو لسّی نمبرداروں کے گھر سے لینے جایا کرتے تھے۔

ان دنوں میں پانچویں یا چھٹی میں پڑھتا تھا۔ دادی آٹا گھر کی چکّی سے پیستی تھی۔ بے بے کھیتوں سے چارہ لاتی تھی۔ کام کرتا ہوا تایا لوہے کا آدمی لگتا تھا۔

باپو تگڑا جوان تھا۔ مگر کام نہیں کرتا تھا۔ وہ گاؤں کا پہلا لڑکا تھا جس نے دسویں پاس کی تھی۔ وہ کتابیں رسالے پڑھتا ہوا کامریڈ بن گیا تھا۔ جلدی عینک لگ گئی تھی۔ وہ اخبار پڑھتا اور لوگوں کو سناتا۔ انقلاب زندہ باد کے نعرے لگاتا ہوا پنچوں، سرپنچوں پٹواری تحصیلدار اور تھانے والوں سے لڑتا رہتا تھا۔ وہ کبھی پولیس سے پٹائی کرا کے گھر آجاتا تھا۔ کبھی جیل چلا جاتا تھا اور کبھی گلے میں تھیلا ڈال کر میٹنگوں میں جاتا رہتا تھا۔

گھر میں وہ بے بے سے باتیں کرتا تھا تو مجھے لگتا تھا کہ اب جلدی غریبی کے دُکھ کٹ جائیں گے۔ سب کو پیٹ بھر روٹی ملے گی، گھر ملے گا اور فصل اُگانے کو زمین۔ پھر مرد اور عورتیں ویسے ہی رل مل کر گایا اور ناچا کریں گے جیسے ہمارے گھر میں آکر ڈرامہ سکواڈ کے ورکر گاتے اور ناچتے تھے۔ جن کو دیکھ کر میری دادی اور تایا غصّے میں آجاتے تھے اور کہا کرتے تھے ... 'آ۔گیے بغلیاں ڈال کر ... کنجر۔ اگر دوسرے لوگ بھی ان جیسے ہو جائیں تو بن چکے کام سارے... سارا ملک مجو کام جائے گا'۔

لیکن باپو کہتا تھا، 'پہلے ہم نے دھنوانوں کی لوٹ کھسوٹ کے خلاف لڑنا ہے۔ یہ سیاسی نظام بدلنا ہے۔ پھر کریں گے کام، جٹ کر۔ اپنی محنت خود کھائیں گے'۔

جب وہ پارٹی ورکر کندھوں پر تھیلے لٹکائے آتے تھے تو گھر کے تمام لوگ خفا ہو جاتے تھے، بڑبڑ کرتے تھے۔ مگر وہ لوگ اتنے پیار سے بولتے تھے کہ کوئی ان سے کڑوا بول ہی نہیں سکتا تھا... گھر میں رونق لگ جاتی تھی۔ باپو بھی ان کے ساتھ مل کر گانے لگتا تھا۔ وہ ایک غزل بہت دل سے، آنکھیں میچ کر گانے لگتا تھا... روح کو کھا جائے گا حُسن کا دیرانہ پن...'

جب میں نے دسویں پاس کی تب باپو کو فکر پڑی گھر کی۔ ان دنوں ایک بات ایسی ہوئی کہ گھر کے حالات بدلنے لگے۔ اس برس دادی مر گئی تھی اور تایا بیمار رہنے لگا تھا۔ باپو کو کام کرنا پڑ گیا تھا۔

مربع بندی کے لیے پٹواری، قانون گو اور تحصیلدار گاؤں میں آئے ہوئے تھے۔ وہ ہمارے گھر کے نزدیک فضلے تیلی کے پکے کوٹھے میں بنے پٹوار خانے میں دفتر لگاتے تھے۔ باپو چاہتا تھا کہ ہماری گیارہ بیگھہ زمین آبادی کے ساتھ والی کم زرخیز انیس بیگھہ ریتیلی زمین

کے ساتھ مِلا کر ایک ڈھیری بنا دی جائے۔ تا کہ بارہ آنے قیمت والی کے بدلے پانچ آنے قیمت والی زمین سے بدل دی جائے۔ جس سے اتنی زمین ہو جائے کہ ایک کنبہ کے لیے کافی ہو جائے۔ بالو نے پٹواری کو ایک طرف لے جا کر یہ بات کہی تھی۔ اپنے مزاج کے برعکس دیگر باتوں کی طرح 'سیوا' کر دینے کی بات بھی کہی تھی مگر کام بنتا دکھائی نہیں دیا تھا۔

لیکن وہ کام ایک انوکھے ڈھنگ سے ہو گیا تھا۔ جس کے لیے اسے لوگ اکٹھے کر کے نعرے لگانے کی ضرورت نہیں پڑی تھی... گاؤں میں نکوڑے والوں کی ایک بہو ہوتی تھی۔ اس کا نام 'چھلو' کئی دیہات میں مشہور تھا۔ چھوٹے قد، تگڑی کاٹھی، گورے رنگ، خوبصورت چہرے والی اس عورت کی آنکھیں کسی مرد کو بخشتی نہیں تھیں۔ پاگل کر دیتی تھیں۔ اس نے گاؤں کی تین پیڑھیوں کی سواری کی تھی۔ کوئی میرے جیسا نکما ہی بچ پایا تھا۔

مجھے نہیں معلوم کہ وہ سب بالو نے کیا تھا یا اپنے آپ ہو گیا تھا... نرم سی دوپہر تھی گاؤں کے لوگ بڑے بڑ کے نیچے پٹواری کے گرد جمگھٹ لگائے ہوئے تھے۔ پٹوار خانے میں تحصیلدار آرام کر رہا تھا۔ بالو نے چپکے سے جا کر پٹوار خانے کی کھڑکی پر لاٹھی مار دی تھی۔ وہ چوپٹ کھل گئی تھی تو چھلو شلوار سنبھالتی ہوئی نکل بھاگی تھی۔ مگر تحصیلدار ویسے ہی ادھ ننگا سا بالو کے آگے ہاتھ جوڑے کھڑکی کے اندر کھڑا تھا۔ اس نے منّت سماجت کرتے ہوئے پوچھا تھا 'بتا تیرا کیا کام ہے؟... بس سمجھ لے کہ ہو گیا'۔

ان کا کام سچ مچ ہو گیا تھا۔ اس کی مرضی کے مطابق زمین اکٹھی ہو کر کُل دس ایکڑ بن گئی تھی۔ گاؤں میں لال لکیر کے اندر آبادی کا ٹکڑا بھی ملا تھا۔ جو ہم نے ٹھکروں کو دے کر اس کے بدلے چارہ بونے کے لیے زمین لے لی تھی۔ جب انتقال اراضی ہوا تھا تو بالو نے دہائی دے کر تحصیلدار کو گالیاں دی تھیں۔ اس کے خلاف عرضی دینے کے بہانے اس کے گھر جا کر 'ڈالی' دے آیا تھا۔

لوگوں کو اس کی 'جاٹ ودیا' کا علم تب ہوا تھا جب اس نے گاؤں میں سب سے پہلے بجلی کا ٹیوب ویل گاڑ دیا تھا۔ ہر ایک مشینری کے لیے اس نے سرکار سے قرضہ اور رعایت لی تھی۔ پھر تو سرکار سے جو بھی رعایت ملتی تھی بالو لے آتا تھا۔ بی ڈی او اس سے ڈرتا تھا۔ اس سے

نئے بیج اور کھاد ملتی رہتی تھی۔

جب میں نے بی اے فیل ہو کر کالج چھوڑ دیا تھا تو باپو کے پاس اتنا پیسہ ہو گیا تھا کہ اس نے چاچا دینا ناتھ کی آڑھت کی دوکان میں چوتھی حصّہ ڈال لیا تھا۔ وہ گاؤں سے اناج لے کر جا رہے چھکڑوں کو گھیر کر اپنی دوکان کے آگے لے جا کر ڈھیر کروا لیتا تھا اناج۔ چاچا دینا ناتھ کا لین دین صاف ستھرا تھا۔ جاٹ جنس کے پیسے حاصل کر کے خوش ہو جاتا تھا۔ زبانی اُدھار بھی ملتا رہتا تھا۔ باپو ان کو زیادہ پیداوار لینے کے ڈھنگ طریقے بھی بتاتا رہتا تھا۔ ان کے ساتھ دفتروں کے چکّر بھی لگا لیتا تھا۔

کالج چھوڑ کر میں کھیتی باڑی میں جٹ گیا تھا۔ اس برس باپو نے ٹریکٹر خرید لیا تھا۔ اور مجھے اس پر بٹھا کر کہا تھا 'ہم نے ایک ہی برس میں پیسے پورے کرنے ہیں'، لوگوں کی زمینوں کی جُتائی کے لیے دن میں ٹریکٹر میں چلاتا تھا اور رات کو باپو۔ اسے کام بُڈھ بھول گئے تھے۔ کسی کا کام کروا کر وہ کمیشن کی درانتی چلا لیتا تھا۔ تو بھی لوگ اس کی تعریفیں کرتے تھے۔ اس کا پاؤں کہیں ٹکتا نہیں تھا۔ وہ جو کچھ بھی کرتا تھا، اس سے پیسہ بنتا تھا۔

دوسرے برس ہی جب میرے لیے رشتے آنے لگے تھے تو باپو نے تمام کوٹھے گرا کر نیا مکان کھڑا لیا تھا۔ ہمارے گھر بھی دُور دُور کے رشتہ دار بھی آنے لگے تھے۔ کتنے ہی موسے پھوپھے نکل آئے تھے۔ اصلی مامے تو چکر لگاتے ہی رہتے تھے۔

تایا حضورا کنوئیں والے کوٹھے میں رہنے لگ گیا تھا۔ وہ کام نہیں کرتا تھا۔ وہ پتلی لاٹھی کے ساتھ جڑی ہوئی گنڈاسی سرہانے رکھ کر کھانستا رہتا تھا... ایک صبح میں چائے لے کر گیا تو وہ سویا ہوا تھا۔ نہ کھانسنے نہ ہائے کی آواز، سارے دکھ کٹ گئے تھے... اتنے بڑے تخت پوش پر وہ ہڈیوں کی مٹھی سی بنا ہوا تھا... کیا تھی جاٹ کے اس بیٹے کی جون؟... نہ جی بھر کھایا، نہ پہنا اور نہ ہی عمر بھر عورت دیکھی... پتہ نہیں گاؤں والوں نے اس کا نام 'بیلی' (جس میں سماجی عیب ہو) کیوں رکھ دیا تھا۔ شاید بھوک سے نذاق کیا ہو۔ یا اس نے چڑھتی جوانی میں کہیں ایک گھونٹ پی کر 'بکرے بلائے' (للکارنے والی چیخیں مارنا) ہوں۔ اب جب گھر کے بھاگ جاگے تھے تو وہ چلا گیا تھا۔

ان دنوں میرے لیے رشتہ لے کر اتنے لوگ آتے تھے کہ باپو مشکل میں پڑ گیا تھا۔ اسے پسند ہی نہیں آتا تھا کوئی۔ بے بے اتاولی تھی۔ اس کے پیٹ میں کوئی تکلیف ہو رہی تھی۔ میں خود اتاولا تھا شادی کو۔ آخر کار، دور کے رشتہ دار ماسٹر (موسا) نے اپنے رشتہ داروں کی ایک لڑکی کی تعریف اتنی کی کہ باپو اس کے فریب میں آ گیا۔ ایک مہینہ کے اندر اندر سب کچھ ہو گیا۔ باپو کی گردن ایک بالشت اونچی ہو گئی۔ پیر زمین پر نہ پڑتے تھے۔ کپڑوں کو مٹی لگنے سے بچانے لگ پڑا تھا۔

میرا حال یہ تھا کہ بھوکے جاٹ کو کٹورا مل گیا اور وہ پانی پی پی کر اپھارا کر بیٹھا۔ میرا گھر سے باہر جانے کو دل ہی نہیں کرتا تھا۔ بے بے ہنس کر کوئی طعنہ مار کر باہر نکلتی تھی۔

تقریباً ایک ماہ کے بعد باپو کو پتہ نہیں کیا ہو گیا۔ وہ سیتو پر جھلّانے لگا تھا۔ اسے اس کے کاموں میں عقل شعور کا دخل نظر ہی نہیں آتا تھا۔ غصّہ یہ کہہ کر ظاہر کرتا تھا کہ وہ 'بے بے' کی خدمت ہی نہیں کرتی۔ کبھی کبھی باپو اتنے سخت لہجے میں بولتا جیسے کھیت مزدوروں سے بولتا ہو۔ مجھے اچھا نہیں تھا لگتا۔ مگر میں چاہتا ہوا بھی باپو کے آگے بول نہیں سکتا تھا، اور نہ ہی نظریں اُٹھا سکتا تھا۔ مگر جب کبھی میں سیتو کو روتے دیکھتا تھا تو غصّے میں اُٹھ کر باہر بیٹھک کی طرف جاتا تھا مگر جب اس کی آنکھیں عینکوں میں سے مجھے دیکھتیں، تو میں خاموشی سے لوٹ آتا تھا۔

ایک برس کے بعد سیتو کے بچّی کا جنم ہوا تو باپو کی نظریں اور بھی کڑوی ہو گئیں۔ وہ اس کے بیٹھنے اُٹھنے، چلنے، کپڑے پہننے میں نقص نکالنے لگا تھا۔ بے بے اسے روکتی تو کہتی: 'تم یہی پر کیسے ٹرکتے رہتے ہو؟ ... وہ اس وقت تو خاموش ہو جاتا مگر دوسرے روز پھر وہی باتیں ... رات کو سیتو میرے سینے پر سر رکھ کر اندھیرے میں روتی تھی۔ اس کے آنسو میرے گلے پر ٹپکتے تھے۔ پھر میرے دل میں آگ جلتی تھی، شعلے اُٹھتے تھے۔ دل کرنے لگتا تھا کہ باپو کے دو گھونسے جڑ دوں۔ اس کی پگڑی اور عینک دور جا گریں۔ وہ فرش پر لڑھکتا پھرے ... مگر میں کچھ نہ کر سکا۔ مجھے اس بات کا خیال آ جاتا تھا کہ باپو بے بے کی بیماری کے سبب دکھی ہے۔ بولنا اس کے بس میں نہیں۔ وہ اکثر بے بے کی خدمت میں لگا رہتا تھا۔ بے بے کے پیٹ

میں ناسور تھا۔ جس کے علاج کے لیے باپو کبھی کہیں لے جاتا تھا اور کبھی کہیں ... خدمت ہم بھی کرتے تھے مگر باپو تو جیسے اس کے ساتھ ہی کمزور پڑنے لگا تھا۔ اس کے ماتھے میں چار گہری لکیریں پڑ گئی تھیں۔ داڑھی ٹھڈی پر سفید ہونے لگی تھی۔

سیتو تڑکے اٹھ کر چولھا جلا لیتی تھی۔ میں چائے لے کر بے بے اور باپو کے پاس جاتا تھا۔ انھیں جھوٹ بتاتا تھا کہ چائے میں نے بنائی ہے تاکہ باپو خوشی سے پی لے۔ اسے سیتو کی بنائی چائے سے بھی نفرت تھی۔ جب وہ شہر چلا جاتا تھا تو میں اور سیتو بے بے کی خدمت کرتے تھے۔ سیتو بے بے کے سامنے بیٹھی بھی رو پڑتی تو بے بے اسے دلاسا دیتی ہوئی کہتی تھی: ''کوئی نہیں بھلی بٹیا ... بھئی اس کی تو عادت ہی کڑوا بولنے کی ہو گئی ہے ... پتہ نہیں اسے کیا ہو گیا ہے؟''... لیکن جب باپو سیتو کو جھڑکتا تھا تو بے بے روکتی نہیں تھی۔ وہ خود بھی دوسری بوڑھی عورتوں کو بتاتی تھی کہ سیتو نے بیٹے کو پتہ نہیں کیا گھول کر پلا دیا ہے۔ باؤلا سا ہو گیا ہے۔ اسے اپنے سے کوئی بات سوجھتی ہی نہیں۔

بے بے کی یہ بات کسی حد تک ٹھیک بھی تھی۔ شادی ہوئی کو ڈیڑھ برس بیت چکا تھا۔ پھر جب سیتو دیکھتی تھی تو جان نکال لیتی تھی۔ باپو ہمیں اکٹھے بیٹھے دیکھ کر جل جاتا تھا۔

بے بے نے زیادہ سیوا نہیں کرائی تھی۔ ہسپتال میں آپریشن ہونے کے تیسرے دن ہی سورگباس ہو گئی تھی۔ باپو کو بہت دھکا لگا۔ جس کے بارے میں لوگ کہتے تھے کہ گردن میں کیل ٹھکے ہوئے ہیں، پیسے نے دماغ کر دیا ہے، وہ فقیر سا بنا پھرتا تھا۔ نہ خوشی سے کچھ کھاتا تھا، نہ بولتا تھا۔ سارا دن چوبارہ میں لیٹا رہتا۔ شہر کو چلا جاتا تو دو دو روز چاچا دینا ناتھ کے چوبارہ میں ہی پڑا رہتا۔ میں بلانے جاتا تو اس کی باتوں سے پتہ چلتا کہ وہ وہاں ہی خوش ہے۔ اسے اپنے گھر سے ڈر لگنے لگا تھا۔ وہ کوئی دوائی کھاتا تھا اور سویا رہتا تھا۔

پھر جب بے پال پیدا ہوا تو باپو گھر آنے لگ پڑا تھا۔ سیتو کا پکایا کھانا بھی کھانے لگا تھا۔ اس نے پوتے کے جنم کی خوشی بھی منائی۔ زچگی کے موقع پر آئی اپنی سالی کو بہت قیمتی چیزیں خرید کر دی تھیں۔ گاؤں کے براہمنوں کے گھروں میں بہت کچھ دیا گیا تھا۔ گوردوالے

اور مندر کو دان دیا گیا تھا۔

لیکن وہ گاؤں میں زیادہ راتیں نہیں تھا گزارتا۔ دن ڈھلتے ہی شہر چلا جاتا تھا۔ مجھے اُڑتی اُڑتی سی خبر ملی تھی کہ وہ کسی کے گھر میں بیٹھ کر شراب پیتا ہے۔ اور کسی بیوہ عورت کے ساتھ اس کے تعلقات بھی ہیں... کچھ بھی ہو، گھر میں ہم باپو کی غیر موجودگی سے اچھا اچھا سا کچھ محسوس کرنے لگے تھے۔ گھر میں حکومت کی باگ ڈور سیتو کے ہاتھ آگئی تھی۔

ایک دن چاچا دینا ناتھ باپو کو اپنے اسکوٹر پر بیٹھا کر گھر چھوڑنے آیا۔ باپو کے چہرے پر چوٹوں کے نشان تھے، سوزش تھی۔ چاچا نے بتایا کہ اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ اس کی سیوا کرو۔ پھر مجھے ایک طرف لے جا کر کہنے لگا: "دیکھ بیٹے، ماں باپ کی سیوا سے بڑا کوئی پن نہیں۔ اس سے ہی سورگ ملتا ہے۔"

ہم نے اتنی اچھی سیوا کی کہ باپو پندرہ روز میں ہی گھوڑے جیسا ہو گیا... خواہ مجھے پتہ چل گیا تھا کہ باپو کا ایکسیڈنٹ نہیں ہوا، اسے اسی گھر میں مارا پیٹا گیا ہے، جس عورت کے گھر وہ جایا کرتا تھا، تو بھی میں نے غصہ نہیں کیا۔ اس کو پھلوں کے رس کے ساتھ بڑھیا شراب بھی لا کر پلاتا رہا تھا۔ جس سے اس کے گالوں میں سُرخی آگئی تھی۔ وہ بہت اکڑ کر چلنے لگا تھا۔ کھیتوں میں چکّر لگا آتا تھا۔ مگر شہر کو نہیں جاتا تھا۔ اڑوس پڑوس میں بیٹھا رہتا تھا۔ گھر میں مویشیوں کو پانی پلا دیتا تھا۔ رسوئی میں سیتو کے پاس بیٹھ کر خود چائے بنا کر پی لیتا تھا۔ اس کے پاس ہی بیٹھ کر گرما گرم روٹی کھا لیتا۔

ایک روز سیتو نے مجھے بتایا کہ باپو اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہتا ہے۔ میں نے کہا: "چلو کوئی بات نہیں۔ اس کی نظر کمزور ہے۔ عینک کے شیشوں میں سے آنکھ پھیلی دکھائی دیتی ہو گی... پھر ایک دن اس نے بتایا کہ باپو اس کو نہارہی کو دروازے کی درزوں میں سے دیکھتا رہا۔ میں کوئی جواب دیئے بغیر ٹریکٹر لے کر چلا گیا تھا... پھر ایک روز میں نے دیکھا کہ باپو بیٹھک میں بیٹھا ہے۔ اس کے ساتھ پڑی کرسی پر ڈھلے کپڑے پڑے تھے۔ وہ سب سے اوپر رکھے سیتو کے نیچے کے چھوٹے کپڑوں پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ ایک دن میں نے اسے سیتو کی پڑی قمیض کو اُٹھا کر سونگھتے ہوئے دیکھا۔ مجھے بُرا لگا کہ باپو یہ

بچوں جیسی حرکتیں کیوں کیے جاتا ہے؟ یہ پاگل تو نہیں ہو گیا کہیں؟

رات کو میں اس کے سرہانے دودھ اور پانی رکھنے جاتا تو وہ مجھے پاس بیٹھا لیتا۔ یہ نہ پوچھتا کہ فلاں کھیت میں اس دفعہ کیا بونا ہے؟ گیہوں کے کھیت میں سے خودرَو لُوٹے ختم کرنے کے لیے کون سی دوائی چاہیے؟ یا فلاں پُوربیا بھاگ گیا، اب کون سا رکھنا ہے؟ ... وہ بے بے کی باتیں کرنے لگتا۔ وہ یہ کرتی تھی۔ وہ یہ کہا کرتی تھی۔ اس کو یَن... میں اس کی بات کاٹ کر کوئی اور بات کرنے لگ جاتا تھا۔

ایک رات روشنی جل رہی تھی اور میں اور سیتو رضائی میں لیٹے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ اچانک سیتو کہنے لگی: "وہ... دروازے کی اوٹ میں باپو کھڑا ہے۔"

پہلے تو میں اس کا وہم ہی سمجھا۔ پھر جلدی سے اُٹھ کر دروازہ کھولا تو کوئی شخص بھاگ کر جاتا ہوا دکھائی دیا۔ میں پیچھے نہیں گیا۔ چپ چاپ جا کر اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔

پھر میں آگ بگولہ ہو کر سانڈ کی طرح پھنکارتا ہوا باپو کے پاس گیا۔ وہ منہ سر لپیٹ کر لیٹا ہوا تھا۔ میرا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ میں نے اس کے چہرے پر سے چادر اُتار کر پھینک دی۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگا:

"اس ڈنگر ڈھور کو سمجھا کچھ۔"

اس نے اور بھی کچھ کہا مگر مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔ میں نے اس کا گریبان کھینچ کر دو دھول جما دیئے۔ اس کی عینک اور پگڑی دور جا گری۔ وہ باؤلی سی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر وہ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ سر نیچا کر کے گھٹنوں میں دے لیا۔ پھر بے بے کا نام لے کر بلند آواز سے رونے لگا۔ مجھے لگا کہ میری باہوں کی بے پناہ طاقت کے سامنے وہ کوئی چیتھڑا سا ہے ... پھر میں اس کا رونا برداشت نہ کر سکا۔ میں نے اس کی پگڑی اور عینک اُٹھا کر میز پر رکھ دیں۔

سیتو کے پاس آ کر بھی میں کچھ نہیں بولا۔ سوچتا رہا کہ یہ مجھ سے کیا ہو گیا ہے؟

آدھے گھنٹے کے بعد میں پھر باپو کو دیکھنے گیا تو وہ وہاں نہیں تھا۔ منڈی کو چلا گیا تھا۔ پھر کئی دن گزر گئے تو میں جا کر لے آیا تھا اسے۔

دو چار روز کے بعد باپو کو وہی دورہ پھر پڑ گیا ... وہ جی بھر کر شراب پیتا اور سیتو

کو گالیاں دینے لگتا... گالیاں کیا عورتوں کی طرح طعنے دیتا۔ اس کو کھانے پکانے کی عقل نہیں۔ اس کو بولنے کی تمیز نہیں۔ بیٹھنے اٹھنے کا سلیقہ نہیں۔ اسے ہگنا موتنا بھی نہیں آتا ... ایسا ہی کچھ واہیات سا بکتا رہتا... مَیں کانوں میں روئی ٹھونس کر لیٹا رہتا۔ سوجاتا، یا سوچتا کہ یوں شرابی آدمی ہے۔ بول رہا ہے۔ بولنے دو۔

کچھ مہینوں کے بعد بابو سچ مچ پاگل ہو گیا۔ شراب پیئے بغیر ہی گالیاں دینے لگتا۔ یہ چڑیل کھا گئی ہے، اپنی ساس کو... اس نے ہمارا گھر اجاڑ کر اپنے باپ کنجر کا گھر بھر دیا... اس... نے زمین کہاں سے خریدی؟ اس کا ماما بیٹی... پانچ ہزار لے گیا تھا، دو برس پہلے۔ اب آتا ہے لوٹانے؟ میں نے تو یہ چڑیل اس گھر میں رہنے نہیں دینی... اور کروں گا بیاہ اپنے پوت کا۔

وہ تو سیتو کو گھر سے نکالنے کے لیے سچ مچ رشتہ داروں اور پنچوں کو بلانے لگا تھا... میں نے سیتو کے ماما کو چوری سے روپے بھیجے کہ وہ بابو کو دے جائے آکر۔ مگر معلوم ہوا کہ میرے سُسر نے جو رقم بابو سے لی تھی وہ موٹی تھی۔ لوٹاتا کہاں سے؟ بابو تو خوش ہو کر دوستی کے ناتے دی ہوئی چیزوں کی قیمت بھی لگانے لگا تھا... پھر یہ کہنے لگ گیا تھا کہ کیا مانگتے ہیں وہ چھوڑ چھڑائی (طلاق) کا؟ میں ایک لاکھ روپے دینے کو تیار ہوں۔

تقریباً مہینہ بھر یہ لڑائی جھگڑا اور صلح سمجھوتہ کا ہنگامہ چلتا رہا... ایک اور دن ڈھلے سیتو کا بھائی میرے پاس سیدھا کھیتوں میں آگیا۔ ہم مشورہ کرتے رہے کہ بابو کو کس طرح ٹھیک کیا جاسکتا ہے۔ وہ غصّے میں کہنے لگا "اب تو انتہا ہو چکی ہے، اب تو جاٹ ودیا ہی کام آئے گی"... مگر یہ بات مجھے تسلیم نہیں تھی۔ میں چاہتا تھا کہ طریقہ ایسا ہو کہ بابو کو چوٹ بھی نہ لگے اور سیتو بھی گھر میں بستی رہ جائے... میں نے بابو کی وہ حالت دیکھی تھی جب وہ چاچا کے چوبارہ میں لیٹا روتا تھا... جب میں نے اس بڑبڑاتے شرابی کو تھوڑا سا ہی جھنجھوڑ دیا تھا تو وہ رضائی کی روئی کی طرح چارپائی پر گر پڑا تھا... جب میں نے اسے ایک بار شرابی حالت میں اٹھا کر چوبارہ سے اُتارا تھا تو اس کا وزن مجھے سیتو جتنا ہی لگا تھا۔

اندھیرا ہونے پر ہم گھر آئے۔ سیتو کے بھائی نے پھاٹک کھولا تو لگا، وہ غصّے میں جل رہا ہے۔ میں نے ٹریکٹر ٹین کی چادروں والی چھت کے نیچے کھڑا کیا ہی تھا کہ بابو کی بیٹھک میں سے

سیتو چیختی چلاتی باہر نکلی۔ جیسے سانپ نے ڈس لیا ہو۔ میں بھاگ کر اس کے پیچھے بڑے کمرے میں گیا۔ وہ باپو کو گالیاں دیتی ہوئی کہہ رہی تھی: "تیرے باپ کنجر نے پکڑ لی میری بانہہ... مجھے یہاں سے پکڑا... مجھے یہاں سے پکڑا... اُسے موت نہیں آتی، میرے ربا... سویا ہی رہ جائے کسی رات... حرامی نے گھر میں بیٹی نہیں دیکھی... شرم نہیں سفید داڑھی کی..."

میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر بٹھا دیا۔ تاکہ پڑوسی نہ سن پائیں۔ جب میں باہر آنگن میں آیا تو سیتو کا بھائی آنگن کے درمیان میں کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کرپان تھی۔ لوگ اکٹھے ہونے لگے تھے...

ہم بیٹھک میں گئے تو باپو وہاں نہیں تھا۔ وہ اندھیرے میں بھاگ گیا تھا۔ روٹی والی تھالی اوندھی پڑی تھی۔ روٹی، سبزی، بھاجی سب کچھ بکھرا پڑا تھا۔ سیتو کی چوڑیوں کے ٹکڑے بھی پڑے دکھائی دیتے تھے۔ باپو اپنی گرم چادر بھی نہیں اُٹھا سکا تھا۔

میں سیتو کے پاس گیا۔ وہ چارپائی پر اوندھی پڑی سسک رہی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی ایک بانہہ پر چوڑی کے کانچ لگنے سے خون اب بھی رس رہا تھا۔ گریبان سے کُرتا کپڑا چھڑانے کے عمل میں پھٹا پڑا تھا۔ وہ مجھے اتنی کڑوی نظر سے دیکھ رہی تھی جیسے وہ اتنا بڑا جرم یا گناہ میں نے کیا ہو... میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دلاسا دیا اور خاموش ہو جانے کو کہا تو وہ زخمی سانپ کی طرح کروٹیں لیتی رونے لگی۔

لوگوں کو میں نے 'کچھ نہیں... کچھ نہیں' کہہ کر یہ بتا کر چلتا کر دیا کہ سیتو کو تتیے نے کاٹ لیا ہے۔

باپو پھر گاؤں واپس نہیں آیا تھا۔ میں ہی چاچا کے چوبارہ میں اسے دیکھنے گیا تھا۔ وہ بیمار تھا۔ اس کا چہرہ پیلا ہو گیا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ رات کے واقعہ کی کوئی بات نہیں کی۔ اس نے بھی کوئی صفائی پیش نہیں کی۔ لوٹنے کو صرف اتنا کہا تھا "گھر کو سنبھال کے رکھنا... میں نے بہت خون پسینہ ایک کر کے جوڑا بنایا ہے... کسی دن بچے بال کو لے کر آنا... مجھے دکھا لے جانا..."

پھر باپو ایک مہینہ پورا بھی زندہ نہیں رہا تھا۔ چاچا کا منیم پیغام لے کر آیا تھا۔ میں ٹرالی

پر باپو کا فرنک شریر لادکر گاؤں لے آیا تھا۔ بہت لوگ اکٹھے ہوئے تھے۔ طرح طرح کی باتیں ہوتی رہی تھیں ... داہ سنسکار ہو گیا تھا۔ میں اور چاچا گنگا میں پھول ڈال آئے تھے۔

گھر میں ہم باپو کی بات کبھی کبھار ہی کرتے تھے۔ میرے سالوں کا آنا جانا بڑھ گیا تھا جب سیتو نے دوسرے بیٹے کو جنم دیا تو گھر کا سوگ ڈھل گیا تھا۔ ہم نے شادی کی طرح خوشی منائی تھی .... پھر باپو بھی یاد آنے لگا تھا۔ ہم اس کی برسی پر پاٹھ رکھوانے لگے تھے۔

پھر سیتو کے دل میں سے باپو والی بات کا دکھ نکل گیا۔ ایک رات ہم بیٹھے باپو کی باتیں کر رہے تھے۔ میں نے سیتو سے پوچھا" باپو نے تجھے کیسے چھیڑا تھا؟"

وہ ہنستی ہوئی کوئی کوئی بات بتاتی رہی جب میں نے ہاتھ لگا کر پوچھا کہ یہاں ہاتھ لگایا تھا؟ یہاں ہاتھ لگایا تھا؟ ... تو وہ مسکراتی ہوئی کہنے لگی: "سچی بات بتاؤں؟"... میں نے کہا "ہاں بتادے۔" تو اس نے بتایا کہ ـــ باپو نے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ تھالی میں نے خود ہی پرے پھینک دی تھی ... چوڑیاں دیوار سے ٹکرا کر توڑ دی تھیں ... اور گریبان خود ہی پھاڑ لیا تھا ... پھر چیخیں ماردیں ... معلوم تھا کہ میرا بھائی آیا ہوا ہے۔"

"تو نے ایسا کیوں کیا؟" میں اُٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

کہنے لگی" اگر نہ کرتی اُس نے مجھے تیرے گھر بسنے دینا تھا کہیں؟" کہہ کر اس نے مجھے اپنی بانہوں میں بھر لیا تھا۔ مگر مجھے لگا تھا کہ میرے ساتھ سیتو نہیں، باپو کا مردہ سا کچھ لیٹا ہوا ہے۔

●

پریم پرکاش کی کہانیوں کی انفرادیت اس بات میں ہے کہ یہ مختلف قدروں والے قیامت خیز عمل کو مقبولیت کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ جو کہانی کار کے مخصوص شعور کا حصّہ ہے اردھناریشور کی مسلّم صورت وہ ہے جس میں وہ بیک وقت مرد اور عورت ہے والا رویّہ اپنائے ہوئے نظر آتا ہے۔

پریم پرکاش حاصلِ زمانہ کی بنیادوں پر لامنتہا رویّہ کی کہانیوں کا مصنّف ہے۔ جس کے فن کے امکانات کہیں ختم نہیں ہوتے۔

اس مجموعہ کے مترجم خود پریم پرکاش (۱۹۳۲ء) ہیں۔ آپ کے اب تک دس سے زیادہ افسانوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے افسانوں میں انسانیت کی کوری دُہائی دیئے بغیر اپنے کرداروں کو ایسے مقام پر پہنچا دیا گیا ہے جو اپنے پڑھنے والوں میں بے حد مقبول ہوئے ہیں۔

پریم پرکاش کو اس مجموعے کے لیے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔

مصوّر: کرشن کیتن

ISBN 81-260-0313-8

قیمت: 75 ستّر روپے